احتشام حسین کا تنقیدی شعور

ڈاکٹر شائستہ انجم نوری

احتشام حسین کا تنقیدی شعور

ڈاکٹر شائستہ انجم نوری

ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ-۴

Ehtesham Hussain Ka Tanqidi Shaoor

Dr. Shaista Anjum Noori
Associate Professor
Deptt. of Urdu,
T. P. S. College, Patna - 800001
Cell : 09431460601

Edition : 2014
Price : 250/-
ISBN - 978-81-925836-7-9

کتاب : احتشام حسین کا تنقیدی شعور
مصنف : ڈاکٹر شائستہ انجم نوری
اشاعت : ۲۰۱۴ء
تعداد : ۵۰۰
کمپوزنگ : شہناز بانو، شاہ کی املی، پٹنہ
قیمت : ۲۵۰/- روپے
طباعت : ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، پٹنہ-۴
دستیاب : A/1-3, 2nd Floor, Ali Nagar, Near Gulshan Plaza,
P.O. Anisabad, Patna-800002
۲- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-۴
۳- پرویز بک ہاؤس، سبزی باغ، پٹنہ-۴

شریک سفر

مشتاق احمد نوری

کے نام

جن کے بغیر

میں

مکمل ادھوری ہوں

E Books
WHATSAPP GROUP

***

حرف اول

اردو تنقید کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ سخن فہمی اور سخن شناسی کے ہر عہد میں تنقیدی شعور موجود رہا ہے اور زیریں سطح پر ہی سہی شعور نقد فنکاروں کے اندر پرورش پاتا رہا ہے۔ اس کی مثالیں شاعروں کے کلام پر تبصروں، تذکروں، تقریظوں، دیباچوں اور مکاتیب میں بھی نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ خود فنکاروں کی آپسی چشمکیں اور معاصرانہ فنی اور نظریاتی اختلافات کے پیچھے بھی یہی شعور کارفرما نظر آتا ہے۔ میر و سودا، آتش و ناسخ، انیس و دبیر، غالب و ذوق اور امیر و داغ کے مابین چلنے والے ادبی معرکوں میں بھی تنقیدی شعور واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں نے ادب کو بھی متاثر کیا۔ آزاد نے قدیم رنگ سے اختلاف و انحراف کیا اور نئی راہ نکالنے کی کاوش کی۔ حالی کی "مقدمہ شعر و

شاعری'' نے شاعری کے مقصدی اور پیامی نیز تبلیغی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ انہوں نے حقیقی شاعری کے لئے اصلیت، سادگی اور خلوص کو ضروری قرار دیا۔ اس باب میں شبلی نے بھی حالی کی پیروی کی یعنی آزاد، حالی اور شبلی نے مغربی افکار و نظریات کے تحت ادب میں اور معیار نقد میں خاطر خواہ تبدیلیاں کیں۔ حالی نے باضابطہ اعلان کیا:

حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

''مقدمہ شعر و شاعری'' کے ذریعہ حالی نے اردو شاعری کے معیار و نظریات وضع کیے۔ حالی کے بعد آج تک اردو تنقید نے ایک طویل سفر طے کیا۔ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے مغربی ادب سے استفادہ کیا اور آج اس موڑ پر ہے جہاں دوسروں سے آنکھ ملانے کی تاب بھی رکھتی ہے۔ حالی کے بعد امداد امام اثر، وحید الدین سلیم، عبدالرحمٰن بجنوری، عبدالماجد دریابادی، مہدی افادی، نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، سجاد ظہیر اور احتشام حسین وغیرہ نے اپنی تنقیدی کاشوں سے اردو تنقید کو درجہ کمال تک پہنچا دیا ہے اور اردو تنقید تبصرہ و تشریح کی حدوں سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ اپنی ادبی روایات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ اس کی نظر آفاقی قدروں پر بھی ہے۔

مختلف ادبی تحریکوں، رجحانات اور مسلک و عقائد نے ناقدین کو بھی مختلف گروہوں میں تقسیم کیا ہے، اور ہر ناقد تنقید کے جس مسلک یا دبستان سے وابستہ ہے اس کو دوسرے سے بہتر تصور کرتا ہے۔ اس تصادم اور نظریاتی علاحدگی کے باوجود جن چند ناقدین نے اردو تنقید کے اصول مرتب کیے ہیں، ان میں پروفیسر احتشام حسین کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کا امتیازی وصف یہ ہے کہ نظریاتی وابستگی کے باوجود انہوں نے اردو فن تنقید کو ایک واضح سمت دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں اپنا ذہنی میلان ابتدا سے ہی تنقید کی طرف

دیکھتی رہی ہوں۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات پر تنقیدی نگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ میں ادبی سرمائے پر بھی تنقید کی فوقیت کی قائل رہی ہوں۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ تنقید تخلیق کے پیچھے پیچھے چلنے والی چیز ہے، یعنی تخلیق کار نقاد کو جنم دیتا ہے۔ ممکن ہے یہ کلیہ کسی زمانے میں درست رہا ہو اور اب بھی بعض حضرات اسے درست مانتے ہوں، لیکن مجھے لگتا ہے کہ نقاد نے ہی تخلیق کاروں کی ہدایت کی ہے۔ اس لئے تخلیق کار نقاد کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہے۔ میرے اس خیال کی وضاحت اس وقت ہو سکتی ہے جب یہاں تنقید اور تخلیق کے باہمی رشتے سے بحث کی جائے لیکن یہاں اس بحث کی ضرورت نامناسب معلوم ہوتی ہے —— جب میں تخلیق کے دائرے سے آگے نکل کر تنقید کے دائرے میں آئی اور ناقدین کا مطالعہ کیا تو میری نگاہ اردو کے سر برآوردہ نقاد پروفیسر احتشام حسین پر پڑی۔ میری نگاہ میں احتشام حسین دور جدید میں اردو تنقید کے امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

احتشام حسین ایک اچھے انسان بھی تھے، دیدہ ور نقاد بھی تھے اور ان کی دوسری ادبی صلاحیتیں بھی تھیں۔ عظیم شخصیتیں اور ان کے کارنامے تاریخ کے ایک عہد کی نشاندہی کرتے ہیں۔ احتشام حسین ایسے ہی لوگوں میں سے تھے، جنہوں نے پورے ایک عہد کو متاثر کیا ہے۔ بچپن سے ہی شعر و ادب سے ان کی دلچسپی بے انتہا تھی۔ ابتدائی دنوں میں افسانہ نگاری کی طرف متوجہ رہے۔ پھر مضامین لکھنے لگے۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں طلبا کے درمیان ہونے والے تحریری و تقریری مقابلوں میں ہمیشہ اول آتے رہے۔ ادبی زندگی کی باضابطہ ابتدا ۱۹۳۱ء کے آس پاس ہوئی۔ اس وقت آپ کالج کی ملازمت میں آچکے تھے۔ دھیرے دھیرے مطالعہ و مشاہدہ، سیر و سیاحت، علمی و ادبی تحریکات سے وابستگی نیز ادبی و سیاسی شخصیتوں کے ساتھ نشست و برخاست سے ان کی شخصیت کا مسلسل ارتقا ہوتا رہا۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "ویرانے" ۱۹۴۴ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ کتاب ان کی ادبی زندگی کا حرف آغاز ہے۔ اس مجموعے کی اسی زمانے میں مختلف مقامات سے چار بار اشاعت احتشام حسین کے مقبول اور کامیاب افسانہ نگار ہونے

کی دلیل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے وقیع اور جامع علمی و ادبی مضامین، تبصرے اور دیگر نگارشات پابندی کے ساتھ ملک گیر پیمانے پر اشاعت پذیر ہونے لگے، کتابیں منظر عام پر آنے لگیں، اور بیشتر کتابوں کے دوسرے تیسرے ایڈیشن منظر عام پر آئے۔ بحث و مباحثے میں، سمینار نیز ادبی مجلسوں میں شرکت نے بحیثیت ناقد انہیں شہرت دوام عطا کی۔

جان بیمز کی کتاب کا ترجمہ ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' مع مقدمہ و حواشی نے جہاں انہیں بحیثیت مترجم مقبول کیا وہیں ماہر لسانیات کی حیثیت سے بھی انہیں ممتاز مقام دلایا۔ ''اردو ساہتیہ کا اتہاس''، ''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' نیز تاریخ کے موضوع پر لکھے گئے دوسرے مضامین انہیں مورخین کی فہرست میں اونچا مقام دلواتے ہیں۔

احتشام حسین کا سفرنامہ ''ساحل اور سمندر'' نہ صرف امریکہ اور یوروپ کے سفر کی دلچسپ روداد پیش کرتا ہے بلکہ اس کتاب کو اردو سفرناموں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ ا-ح نورازل کے فرضی نام سے لکھی گئی ان کی منفرد آزاد نظموں پر مشتمل مجموعہ ''روشنی کے دریچے'' انہیں اپنے عہد کے بہت سے شاعروں پر فوقیت بخشتا ہے۔

احتشام حسین نے بہت سی درسی و غیر درسی کتابوں کی ترتیب و تدوین کا کام بھی انجام دیا ہے۔ علمی و ادبی رسائل کے خصوصی گوشے اور نمبر بھی مرتب کیے ہیں۔ انہوں نے ریڈیائی فیچر اور کامیاب اسٹیج ڈرامے بھی قلم بند کیے ہیں۔ ان تمام کاموں کے علاوہ انہوں نے بے دریغ نئے شعرا و ادبا کی کتابوں پر تقریظ، پیش لفظ، مقدمے اور دیباچے بھی لکھے ہیں۔ اس معاملے میں انہوں نے خاصی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسی طرح مکتوب نگاری کے معاملے میں بھی خاصے مقبول رہے ہیں۔ ان کے مکتوب بھی اردو مکتوب نگاری کے باب میں نظر انداز نہیں کیے جاسکتے ہیں۔

ان تمام سرمایوں کے باوجود بحیثیت ناقد ان کی شہرت اپنی جگہ اس قدر مسلم ہے، ان کا تنقیدی شعور اس قدر روشن اور تابناک ہے کہ ان کی دیگر علمی و ادبی کاوشیں اس کے پیچھے ماند

پڑ جاتی ہیں۔ احتشام حسین کے تنقیدی مضامین کے نو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''تنقیدی جائزے'' ہے۔ اس میں دیباچے کے علاوہ بارہ تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ۲۹۸ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۴۴ء میں اور دوسری بار ۱۹۴۹ء میں منظر عام پر آیا۔ ۱۹۷۰ء تک اس مجموعے کی کل چھ اشاعتیں منظر عام پر آئیں۔

دوسرا مجموعہ ''روایت اور بغاوت'' ہے۔ اس میں بھی دیباچے کے علاوہ بارہ تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ۳۱۲ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۴۷ء میں اور دوسری بار ۱۹۵۶ء میں منظر عام پر آیا۔ تیسرے مجموعے ''ادب اور سماج'' میں دیباچے کے علاوہ گیارہ مضامین شامل ہیں۔ ۱۹۰ صفحات پر مشمل یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۴۸ء میں منظر عام پر آیا۔

چوتھے مجموعہ ''تنقید اور عملی تنقید'' میں دیباچے کے علاوہ پندرہ تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ۲۷۲ صفحات پر مشتمل اس مجموعے کی پہلی اشاعت ۱۹۵۲ء اور دوسری اشاعت ۱۹۶۱ء میں ہوئی۔

پانچویں مجموعہ ''ذوق ادب اور شعور'' میں سولہ تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ۲۵۵ صفحات پر محیط یہ مجموعہ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

چھٹا مجموعہ ''عکس اور آئینے'' ہے۔ اس مجموعے میں دیباچے کے علاوہ چودہ مضامین شامل ہیں۔ ۲۵۵ صفحات پر محیط یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۶۲ء اور دوسری ۱۹۷۰ء میں منظر عام پر آیا۔

ساتواں مجموعہ ''افکار و مسائل'' ہے۔ اس مجموعے میں ۲۵ مضامین شامل ہیں۔ ۱۵۸ صفحات کا یہ مجموعہ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔

آٹھواں مجموعہ ''اعتبار نظر'' میں ۲۸ مضامین شامل ہیں۔ ۳۰۰ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ یہ احتشام حسین کی زندگی میں شائع ہونے والا ان کے مضامین کا آخری مجموعہ ہے۔

احتشام حسین کے انتقال کے بعد ان کے مضاین کا نواں مجموعہ ''جدید ادب: منظر و پس

منظر'' ان کے صاحبزادے جعفر عسکری نے مرتب کیا۔ ۲۷۲ صفحات کے اس مجموعے میں ۲۱ تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۷۸ء اور دوسری بار ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آیا۔

ان مجموعوں میں شامل مضامین کے علاوہ احتشام حسین کے بیسیوں مضامین اب بھی ایسے ہیں جو اخبارات و جرائد میں دفن ہیں اور جن کی بازیافت کی ضرورت ہے۔ بہر حال ان کتابوں اور مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ احتشام حسین اردو کے وہ جلیل القدر اور تاریخ ساز نقاد تھے جنہوں نے پہلی بار مغربی ناقدین سے نہ صرف آنکھیں ملا کر باتیں کیں بلکہ اردو تنقید کو ایک ایسی ڈگر پر لا کھڑا کیا جہاں سے نئی راہیں کھلتی ہیں۔

شائستہ انجم نوری

ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبۂ اردو ٹی پی ایس کالج، پٹنہ ۸۰۰۰۰۱

تنقید نگاری کا فن

اردو ادب میں ''تنقید'' انگریزی لفظ Criticism کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ ''تنقید'' عربی لفظ ''نقد'' اور ''انتقاد'' سے مشتق ہے، مگر عربی زبان میں لفظ ''تنقید'' مشتمل نہیں ہے۔ اس لئے بعض اہل قلم تنقید شعر کی بجائے نقد الشعر (غالباً قدامہ بن جعفر کے اتباع میں) کہنا زیادہ موزوں تصور کرتے ہیں۔

ایلیٹ کے قول کے مطابق تنقید سانس کی طرح ناگزیر ہے۔ رد و قبول اور خوب سے خوب تر کی تلاش و جستجو تہذیب کے بدن میں سانس کی طرح رواں دواں ہے۔ بنی نوع انسان کا پر وقار اور پر امکان تسلسل حیات و تہذیب، نقد و انتقاد کے اجالے میں چلتے ہوئے تلاش و یافت کے عمل میں مصروف ہے۔ جس طرح رد و قبول کا عمل زندگی کے عام معاملات میں نامعلوم طور پر از خود انجام پذیر ہوتا رہتا ہے ٹھیک اسی طرح شعر و ادب میں بھی نامعلوم طور پر تنقید کی کونپل پھوٹی اور دھیرے دھیرے نامعلوم طور پر پرورش پاتی رہی۔ اس طرح جب تنقید کا پودا بار آور ہوا تو اس کی موجودگی کے احساس نے اہل ادب کو اس کی طرف متوجہ کیا اور اس کا نام و پتہ دریافت کیا جانے لگا۔ اس طرح شاعری یا تخلیق کے مقابلے میں تنقید کی عمر کچھ زیادہ

نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تنقید نے تخلیق کے ساتھ ہی جنم لیا ہو۔ جو کچھ بھی ہو مگر تنقید کی تقدیر یہی ہے کہ وہ تخلیق کے پیچھے پیچھے چلے۔ یعنی اس کی پیروی کرے۔ چنانچہ ہر زمانے میں شاعری نے پہلے ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں اور تنقید بہت دنوں تک اس کا دامن پکڑ کر چلتی رہی ہے۔ اس کے ساتھ غیریت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ مگر تنقید اس قدر سخت جان رہی ہے کہ اپنے اوپر ہر وار سہتی رہی ہے۔ شاعروں نے کیا نقادوں نے بھی اس کو پھٹکارا ہے، مگر دھیرے دھیرے تنقید نے ایوان ادب میں اپنا سکہ جمالیا۔

دیگر علوم وفنون کی طرح تنقید کی ابتدا کا سہرا بھی اہل یونان کے سر جاتا ہے۔ تنقید کی ابتدائی جھلکیاں یہیں پہلے دکھائی دیتی ہیں۔ ارسطو سے قبل مختلف شعرا کے یہاں شعر کی ماہیت اور اس کے حسن وقبح سے متعلق واضح اشارات ملتے ہیں۔ ارسطو کے یہاں آکر تنقید با قاعدہ اور منضبط علم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ فن شعر پر ارسطو کی بوطیقا (Poetic) اہمیت اور افادیت کی صدیاں گذار چکی ہے۔

اہل یونان کی طرح اہل عرب میں بھی ابتداً تنقیدی شعور پایا جاتا ہے۔ اسواق عرب میں مجلس شعر وسخن منعقد ہوا کرتی تھیں، جن میں شعرا کے کلام پر تنقیدی رائیں دی جاتی تھیں اور بحث ومباحثے بھی ہوتے تھے۔ قریش کی ''مجلس نادی'' اور جوار کعبہ کی ''مجلس دارالندوہ'' نے بھی عربی تنقید کے لئے بنیادیں فراہم کی ہیں۔ اردو تنقید کی تاریخ میں تذکروں کو تاثراتی تنقید کا ابتدائیہ کہا جاسکتا ہے۔ لغت کی رو سے نقد کے معنی کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کے ہیں۔ چونکہ ادبی تنقید میں شعر وادب کے فن میں شعر کی ماہیت اور اس کے عیوب ومحاسن کا تذکرہ ہوتا ہے اس لئے ادب پاروں کی پرکھ کے اس فن کے لئے تنقید کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔

اپنی انفرادیت اور خصوصیات کے لحاظ سے تنقید ایک باضابطہ اور وقیع صنف ادب ہے۔ یہ تجسس وتفکر کی پذیرائی بھی کرتی ہے اور ایک وسیع ومربوط اور تطبیق کا تسلسل بھی رکھتی ہے۔ تنقید کے لچکدار دائرے میں فن، فن کار اور فن پاروں کی جانچ پرکھ کی جاتی ہے۔ ایک فنی کڑی

کی حیثیت سے مجرد طور پر یا ایک صنف ادب کے لحاظ سے جامع و مانع طریقے سے یا بعض صورتوں میں مجموعی طور پر ہمہ جہت انداز میں دیگر ادب پاروں کے تقابلی مطالعے کے سلسلے میں انتقادی موشگافیاں کی جاتی ہیں۔ موضوع بحث کی تہیں اور پرتیں الٹی جاتی ہیں، جڑیں ٹٹولی جاتی ہیں، پتہ پتہ بوٹا بوٹا دیکھا جاتا ہے اور اس ضمن میں ہیئت و مواد، تجربہ اور ارتقاء کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں سے سائنٹفک انداز میں معروضی نقطہ نظر سے بحثیں کی جاتی ہیں۔

ایک عرصے تک تنقید کے تعلق سے یہ کہا جاتا رہا ہے کہ: Its best days are probably yet to come لہٰذا تنقید کو اردو شعر و ادب کی دنیا میں ایک غیر ادبی سرگرمی کہہ کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہاں تنقید کی ایسی تعریف پیش کی جائے جس کی روشنی میں فن تنقید کو فن شعر کے شانہ بہ شانہ کھڑا کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں تنقید کیا ہے؟ سمجھنے سے پہلے ایک بہتر راستہ یہ ہے کہ پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ تنقید کیا نہیں ہے۔ اس بارے میں آل احمد سرور کا خیال ہے:۔

''تنقید نہ وکالت ہے نہ عدالتی فیصلہ، نہ پرکھ ہے۔ نقاد مبصر ہوتا ہے مبلغ یا مفتی نہیں ہوتا۔'' (۱)

اس سلسلے میں شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے:۔

''تنقید عمومی اور سرسری اظہار رائے نہیں ہے۔ غیر قطعی اور گول مول بات کرنا نقاد کے منصب کے منافی ہے۔'' (۲)

نورالحسن نقوی تحریر فرماتے ہیں:۔

''ادب سائنس نہیں ہے اور تنقید سائنسی طریقہ کار استعمال کرسکتی

---

(۱) دیباچہ ''ادب اور نظریہ''

(۲) ''شب خون'' الہ آباد، شمارہ ۸۶، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۳ء

ہے مگر ریاضی کا وہ عمل نہیں ہو سکتی جس میں ہمیشہ دو اور دو چار (2+2=4) ہی ہوتے ہیں۔''(۱)

متذکرہ بالا خیالات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تنقید وکالت، فقرے بازی اور تبلیغ نہیں ہے۔ یہ مجموعی اور سرسری اظہار خیال بھی نہیں ہے مگر ہمارے تنقید کے جذبے سے سرشار ناقدین نے بعض اوقات مفتیانہ فقرے بازیوں سے کام لیا ہے اور بزعم خود جسے چاہا اقلیم سخن سے نکال باہر کیا اور جسے چاہا شہرت وعظمت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔

اب آیئے یہ دیکھا جائے کہ تنقید کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک سیدھی اور صاف رائے یہ ہے کہ فن پاروں کی افہام و تفہیم اور تقدیر و تعین کا نام تنقید ہے۔ تنقید کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں:-

''کسی فن پارے کے بارے میں رائے، کوئی نقطہ نظر، کوئی وضاحت مختلف فن پاروں سے اس کا مقابلہ اور ان کے باہمی فرق کا نام تنقید ہے۔''(۲)

اس تعریف میں تنقید کے جو وظائف بیان کئے گئے ہیں وہ سب صحیح ہیں کہ تنقید ان سب امور کا احاطہ کرتی ہے۔ مگر اس عمومی تعریف میں پھر ان عیوب کے در آنے کی گنجائش ہے۔ میتھیو آرنلڈ کے نزدیک شاعری زندگی کی تنقید ہے۔ اس کا نظریہ تنقید نظریاتی تنقید کی بازگشت معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

''تنقید کا کام یہ ہے کہ وہ خیالات کا نظام قائم کرتی ہے۔ فرسودہ، بے معنی اور ازکار رفتہ خیالات کو اکھاڑ پھینکتی ہے اور ان کی جگہ زندہ

---

(۱) ''آل احمد سرور کی تنقید نگاری''، مطبوعہ ''الفاظ''، علی گڑھ، مارچ تا جون ۱۹۸۰ء، ص ۷۸

(۲) ''ارسطو سے ایلیٹ تک''، جمیل جالبی، ۱۹۷۷ء، ص ۳

اور ترقی پسند خیالات کو مروج اور عام کر کے اس طور پر سامنے لا کھڑا کرتی ہے کہ ان کی شعلہ سامانی، ان کی لپک مختلف ذہنوں کو ترغیب دلاتی ہے۔ تنقیدی عمل کے ذریعہ یہ خیالات معاشرے تک پہنچے ہیں اور چونکہ صداقت کا احساس خود زندگی کا احساس ہے اس لئے نتیجے کے طور پر عمل اور ردعمل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ خیالات کا ایک زندہ نظام نشو ونما پانے لگتا ہے اور حرکت ونمو کے اس عمل کی کوکھ میں تخلیقی ادوار جنم لیتے ہیں۔"(۱)

ممکن ہے تنقید خیالات کا نظام قائم کرتی ہو، فرسودہ بے معنی اور ازکاررفتہ خیالات کو اکھاڑ پھینکتی ہو اور ان کی جگہ ترقی پسند خیالات کو مروج اور عام کرنے کی سعی کرتی ہو، مگر اس نقطہ نظر سے ایک نتیجہ یہ نکلا کہ نقادوں نے ادب کے وسیلے سے معاشرے اور اقدار کی شکست وریخت اور تعمیر وتنظیم کا مطالعہ تو نہیں کیا شاعروں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ اس طرح ذاتی معتقدات کو شاعر اور شاعری کے ساتھ تھوپنے کا آسان نسخہ اردو ناقدین کے ہاتھ آ گیا۔ میرے کہنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ ترقی پسند خیالات کو مروج وعام کرنا کوئی گناہ ہے یا زندگی سے شعروادب وتنقید کو خدا واسطے کا بیر ہے بلکہ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ فن کا زندگی سے اور تنقید کا فن سے گہرا رشتہ ہے۔ اس سلسلے میں مڈلٹن مرے نے بہت مختصر الفاظ میں بڑے کام کی بات کہی ہے:۔

"جس طرح زندگی کا شعور احساس فن ہے اسی طرح فن کا شعور احساس تنقید ہے۔"(۲)

نقاد کے لئے یہ جاننا ضروری ہے اور جس کی تلاش ادب میں ضروری ہے کہ وہ کیا چیز ہے کہ

---

(۱) "تنقید کا منصب" ترجمہ: جمیل جالبی، مشمولہ: "ارسطو سے ایلیٹ تک" ۱۹۷۷ء، ص ۳۶

(۲) بحوالہ "زاویہ نگاہ"، خلیل الرحمٰن اعظمی، ص ۱۰

جس کے ذریعہ زندگی کے چھوٹے بڑے تجربات ایک عمومی بیان نہ ہو کر ایک فن پارہ بن جاتے ہیں۔ کسی ادبی شخصیت کا سرمایۂ وجود صرف یہی تو ہے کہ اس نے اپنے دور کی دانش کو کس حد تک متاثر کیا۔ کس طرح وہ رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کی طرح اپنے عہد کے شعور میں سرایت کر گیا۔ کس طرح اس کی بصیرت کے چراغ نے دوسرے چراغ روشن کئے جب یوں ہوتا ہے تو پھر جسمانی وجود کے ناگزیر خاتمے اور بھی ادیب کے چہرے پر فاتحانہ تبسم کھیلتا ہے۔

اسلوب ادیب کی شخصیت کے فنکارانہ اظہار کا ذریعہ ہے جس میں عمل، ارادہ، فیصلہ اور مدافعت کی قوتیں اور شعوری و لاشعوری محرکات شامل ہوتے ہیں اسلوب شخصیت کی طرح ارتقا پذیر ہوتا ہے لہٰذا ادیب کی شخصیت کے ارتقا کو ذہن میں رکھے بغیر اسلوب کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

تنقید میں طرز ادا اور اسلوب سے زیادہ مواد اور موضوع کی اہمیت مسلم ہے۔ نقاد اپنی بات کسی پیچیدگی اور الجھاؤ کے بغیر سادہ اور سلیس زبان میں کہنے کی قدرت رکھتا ہو، لہٰذا تنقید کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ جمالیاتی شعور ہے۔ نظریہ ہرگز ادب کی کسوٹی نہیں بن سکتا کیونکہ نظریہ مختلف لوگوں کے لئے مختلف حیثیت رکھتا ہے۔

تنقید کی بنیاد یا اس کی روح کیا ہے اس بارے میں آئی۔اے۔رچرڈ سن کا بیان ہے:-

> ''وہ کون سی شئے ہے جو کسی نظم کے پڑھنے کے تجربے کو قیمتی بناتی ہے؟ یہ تجربہ کسی اور تجربے سے کیوں بہتر ہے؟ ایک تصویر کو دوسری پر کیوں ترجیح دی جائے؟ موسیقی کو ہم کن طریقوں سے سنیں کہ قیمتی ترین لمحات حاصل ہو سکیں؟ فن پاروں کے بارے میں ایک رائے دوسری رائے کی اتنی اچھی کیوں نہیں ہوتی؟ یہ ہیں وہ بنیادی سوالات جن کے جوابات تنقید کو دینے ہوتے ہیں۔''(۱)

---

(۱) ''شب خون''، الہ آباد، شمارہ ۱۱۰، ص ۳۷

اوپر شمس الرحمن فاروقی کی رائے بھی پیش کی گئی ہے۔ فاروقی صاحب شدت کے ساتھ یہ بات محسوس کرتے ہیں کہ تنقید عمومی اور سرسری رائے زنی کا نام نہیں ہے۔ وہ غیر قطعی اور گول مول بات کرنا نقاد کے منصب کے منافی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک تنقید کی یہ تعریف ہے:۔

> ''اول تو یہ خارجی دنیا کے اہم ترین مظہر یعنی ادب کو بیان کرنے کے لئے ایسے الفاظ تلاش کرتی ہے جن کا استعمال درستی اور صحت بیان کے لئے ناگزیر ہو۔ یہ اس لئے کہ جو الفاظ ناگزیر ہوں گے ان میں حقیقت کا شائبہ یقیناً ہوگا کیوں کہ ہر وہ لفظ جسے پس پشت ڈالنا ممکن ہو یقیناً اس شئے سے قریبی تعلق نہ رکھتا ہوگا جسے بیان کیا جا رہا ہے۔ دوسرا کام تنقید یہ کرتی ہے کہ صحیح ترین بیان کی تلاش کے ذریعہ ایسے اصول دریافت کرتی ہے کہ جن کی روشنی میں صحیح بیان تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔ پہلا کام عملی تنقید دوسرا کام نظریاتی تنقید کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ لیکن اکثر یہ دونوں کام ساتھ ساتھ ہوتے رہتے ہیں۔''(۱)

تنقید کے سلسلے میں آر۔ پی۔ بلیک کی تعریف بھی ملاحظہ کیجئے:۔

> ''میں تنقید کو ادب میں شوقیہ دلچسپی رکھنے والے کسی شخص کی منظم اور منضبط گفتگو سمجھتا ہوں۔ جب اس گفتگو میں شوق اور علم کافی مقدار میں موجود ہوتے ہیں تو ایک خود کفیل فن بن جاتی ہے۔ لیکن اسے یکہ وتنہا دوسروں سے لاتعلق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اپنی ہی زندگی میں

---

(۱) ''شب خون''، الہ آباد، شمارہ ۱۰۰، ص ۱۷

دوسرے فنون پر اپنے مسلسل انحصار کی شاہد ہوتی ہے۔''(۱)

تنقید کے سلسلے میں جناب حامد اللہ افسر کی رائے بھی اہم معلوم ہوتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:۔

''تنقید کے لغوی معنی ہیں پرکھنا۔ برے بھلے اور کھرے کھوٹے کا فرق معلوم کرنا۔ بطور ادبی اصطلاح کے بھی اس لفظ کے استعمال میں اس کے لغوی معنی کا اثر موجود ہے۔ ادب کے محاسن اور معائب کا صحیح اندازہ کرنا اور اس پر رائے قائم کرنا اصطلاح میں تنقید کہلاتا ہے۔''(۲)

انسائیکلو پیڈیا امریکانہ میں تنقید کی تعریف یوں ملتی ہے:۔

''محدود معنوں میں تنقید کا مطلب کسی ادب پارے کی خوبیوں اور کمزوریوں کا مطالعہ ہے۔ وسیع تر معنوں میں اس میں تنقید کے اصول قائم کرنا اور ان اصولوں کو تنقید میں قائم کرنا بھی شامل ہے۔ گویا اس میں کچھ نہ کچھ فلسفہ بھی داخل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اصول بندی فلسفیانہ عمل ہے۔''(۳)

انسائیکلو پیڈیا یا برٹینکا میں تنقید کے بارے میں یوں بیان ملتا ہے:۔

''تنقید ایک عمل یا ذہنی حرکت کا نام ہے جو کسی شئے یا ادب پارے کے ان خصائص کا امتیاز کرے جو قیمت رکھتی ہے بخلاف اس کے جس میں قیمت نہیں ہے۔''(۴)

---

(۱) بحوالہ ''نقد الادب''، حامد اللہ افسر، ص ۲۰

(۲) ''نقد الادب''، حامد اللہ افسر، ص ۱۴

(۳) ''انسائیکلو پیڈیا امریکانہ''

(۴) ''انسائیکلو پیڈیا یا برٹینکا''

ٹی ایس ایلیٹ کا بیان ہے:-

''تنقید فکر کا وہ شعبہ ہے جو یا تو یہ دریافت کرتا ہے کہ شاعری کیا ہے؟ اس کے فوائد و وظائف کیا ہیں؟ یہ کن خواہشات کی تسکین کرتی ہے؟ شاعر شاعری کیوں کرتا ہے اور لوگ اسے کیوں پڑھتے ہیں؟ یا پھر یہ اندازہ لگاتا ہے کہ کون سی شاعری اچھی یا بری ہے؟''(۱)

تنقید کے سلسلے میں جمیل جالبی کا خیال بھی کچھ کم اہم نہیں ہے:-

''تنقید کے معنی جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے اعتراض اور نکتہ چینی کے نہیں ہیں۔ اس کے معنی کسی شاعر اور ادیب کی توصیف و تحسین کے بھی نہیں ہیں۔ اگر کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات کا مطالعہ کرنا ہے تو تنقید کا کام یہ ہے کہ وہ اسے اُس کے اپنے دور میں اور ساتھ ساتھ اپنے دور میں رکھ کر دیکھے کہ اس نے تخلیقی سطح پر فکر و احساس اور اسالیب کی دنیا میں کیا کام کیا ہے؟ یہ تنقید کا ایک کام ہے۔ اس کے علاوہ تنقید کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے لئے نظام خیال کی تشکیل نو کرے۔ ہر دور میں مختلف تاریخی دھاروں کے بہاؤ کی وجہ سے جو فکری، سماجی، معاشی اور تاریخی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے کلچر بدلتا رہتا ہے اور پرانا نظام خیال کمزور ہوتا اور ٹوٹتا پھوٹتا رہتا ہے، تنقید کا کام یہ ہے کہ وہ اس نظام خیال کو نئے سرے سے مرتب کرتی رہے تاکہ ایک طرف تغیر میں تسلسل باقی رہے اور دوسری طرف زندگی کے ہر شعبہ میں تخلیق کا عمل جاری

---

(۱) بحوالہ ''ارسطو سے ایلیٹ تک''، جمیل جالبی، ۱۹۷۷ء، ص ۳۳

رہے۔ جب تنقید کام بند کردیتی ہے تو نظامِ خیال کے دوران خون میں خلل واقع ہو جاتا ہے، چیزوں کے رشتے ٹوٹنے لگتے ہیں، الفاظ اپنے معنی کھو دیتے ہیں، اقدار جن پر وہ معاشرہ قائم ہوتا ہے ایک دوسرے سے متصادم ہونے لگتی ہے۔ زندگی نئے تقاضے کرتی ہے اور یہ اقدار انہیں پورا کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ اس لئے ایسے معاشرے کا انسان جس میں تخلیقی انسان بھی شامل ہے، اندر سے ٹوٹ جاتا ہے اور وہ کوئی ثابت تخلیق پیش کرنے سے قاصر رہتا ہے۔"(۱)

تنقید کی مختلف تعریفوں سے گذرتے ہوئے یہ اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے کہ تنقید کا فن اور اس کے اصول و ضوابط خاصے دشوار گذار ہیں۔ تنقید کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ تنقید کے تعلق سے وہی اپنی ذمہ داریاں بہ حسن وخوبی انجام دے سکتا ہے۔ جس کا تجربہ وسیع، مطالعہ عمیق اور نگاہ دور رس رہی ہو۔ جو نہ صرف ذوق صحیح کا مالک ہو بلکہ دریائے ادب کا شناور بھی ہو، جس نے مدت کے گہرے مطالعے اور غور وفکر کے بعد کوئی رائے قائم کی ہو اور وہ نہ صرف اس رائے کو قائم کرنے اور اس سے متعلق اظہار کی قوت وقدرت رکھتا ہو بلکہ دوسروں کی ہدایت بھی کرنے کا حق رکھتا ہو۔

تنقید کے سلسلے میں آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ: "صحیح تنقید کا راستہ بال سے بھی زیادہ باریک ہے۔" سرور صاحب کی یہ رائے بالکل درست ہے، اس لئے کہ صحیح تنقید کا راستہ اس قدر دشوار گذار ہے کہ ذرا سی چوک ہوئی اور معاملہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ جب کہ نقاد کا اصل منصب رہنمائی ہے۔ یہ رہنمائی علم وادب، شعر وفلسفہ اور دوسرے موضوعات میں ہوتی ہے۔ تنقید

---

(۱) بحوالہ "ارسطو سے ایلیٹ تک"، جمیل جالبی، ۱۹۷۷ء، مقدمہ

صحیح معنوں میں ایک فنکار کو گم کردہ راہ ہونے سے بچالیتی ہے کیونکہ تخلیق کار جب اپنی تخلیق پیش کرتا ہے تو اس کو اپنی ہر تخلیق اچھی لگتی ہے۔ جب کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے، اس میں کہیں نہ کہیں رطب و یابس کی گنجائش بھی ضرور رہتی ہے۔ نقاد کا کام انہیں الگ کر دینا ہے۔ یعنی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دینا ہے۔ اس طرح فنکار اور قاری کے درمیان ایک شخصیت نقاد کی رہتی ہے جو فنکار کو اچھی تخلیق کی پیش کش اور قاری کو اچھی تخلیق کے مطالعہ پر آمادہ کرتی ہے۔

تنقید پر بعض حضرات نے اعتراضات بھی کئے ہیں اور بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اچھی تنقید بذات خود اچھی تخلیق ہے۔ آل احمد سرور نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اچھی تنقید کسی طرح اچھی تخلیق سے کم نہیں بلکہ بعض وجوہ سے اس پر فوقیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی رقمطراز ہیں:۔

> ''تنقید بذات خود بھی اہم ہے۔ اس کی خود اپنی ایک تخلیقی حیثیت ہے، وہ خود ایک فن ہے اور فن جس طرح اہمیت کا مالک ہوتا ہے تنقید بھی اہمیت رکھتی ہے۔ ادب کی طرح انداز بیان اور طرز ادا کو تنقید میں بھی زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنایا جا سکتا ہے اور اس میں جمالیاتی خوبیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کیونکہ وہ بھی ادب ہے۔''(۱)

پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنے مخصوص انداز میں دوٹوک رائے کا اظہار کیا ہے کہ:۔

> ''تنقید کی قدر و قیمت کا انکار دراصل زندگی کی قدر و قیمت کا انکار ہے۔''(۲)

---

(۱) ''اردو تنقید کا ارتقا''، عبادت بریلوی

(۲) ''اردو تنقید پر ایک نظر''، کلیم الدین احمد

سر برآوردہ نقاد مجنوں گورکھپوری نے تنقید کی اہمیت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:۔

''تنقید تخلیق کا ایک لازمی جزو ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔''(۱)

تنقید میں اصولوں کی پابندی نہایت اہم ہے مگر ان اصولوں کا قائم کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تنقید میں اصولوں کے مرتبین نے اپنی اپنی ذاتی رایوں کو زیادہ اہمیت دی ہے اور اپنے خیالات کو زیادہ صحیح گردانا ہے۔ نتیجے کے طور پر اکثر جگہ ان اصولوں پر نقاد کی شخصیت غالب آجاتی ہے۔ غالباً اسی لئے پروفیسر احتشام حسین نے کہا ہے:۔

''اگر تاریخ، نفسیات، معاشیات اور سائنس کی مدد سے اصول نقد متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ کوشش رایگاں نہیں جائے گی۔''(۲)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور[۳] نے ادبی تنقید کے چار اصول مرتب کیے ہیں۔ اول یہ کہ کتاب کی ظاہری شکل وصورت یعنی افسانہ، شاعری، ڈرامہ نگاری وغیرہ کے جو اصول وضع کیے گئے ان پر یہ کتاب کہاں تک پوری اترتی ہے۔ دوم یہ کہ کتاب معنی ومطالب کے اعتبار سے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرتی ہے یا نہیں، اگر کرتی ہے تو کہاں تک؟ سوم یہ کہ ادبی فن پارہ کی زبان واسلوب، الفاظ ومعنی میں ہم آہنگی ہے یا نہیں؟ چہارم یہ کہ مصنف کی ذات اس کے ماحول اور اس کی تصنیفات کے ماخذ کا مطالعہ کیا جائے۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر کی رائے بھی اس سلسلے میں نہایت اہم ہے:۔

---

(۱) ''نقوش وافکار''، مجنوں گورکھپوری، ص۱۰

(۲) ''ادب اور سماج''، احتشام حسین، ادارہ فروغ اردو، لکھنو

(۳) ''روح تنقید''، محی الدین قادری زور، ادارہ فروغ اردو، لکھنو

''ادب کی تاریخ کے مختلف ادوار، ہر دور کے ممتاز چھوٹے بڑے ادیبوں اور مختلف اصناف ادب کے مطالعہ کے علاوہ ان سب کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر کے دیکھنے ہی سے ایسے ہمہ گیر اصول تنقید وضع کئے جاسکتے ہیں جو ماضی اور حال بلکہ مستقبل کو بھی جہاں تک ممکن ہو اپنی گرفت میں لے سکیں۔ کسی ادب کی تنقید کے اصول زیادہ تر اسی ادب کی تاریخ اور حدو امکانات سے اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ دوسری زبانوں کے ادب سے ایسے اصول ہی لئے جاسکتے ہیں جو یا تو مشترک پہلوؤں پر مبنی ہوں یا پھر ایسے آفاقی عناصر پر جو جغرافیائی اور تہذیبی عوامل سے بالاتر ہوں۔''(۱)

تنقید میں جب ادبی تنقید کی بات آتی ہے تو معاملہ ذرا اور مشکل ہو جاتا ہے۔ اکثر ناقدین نے ادبی تنقید کو سائنس قرار دینے کی کوشش کی ہے لیکن اس مفروضے کو پورے طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ سائنس باہمی تعلق کی قابل تصدیق اور قطعی شہادتوں کا نام ہے اور ادب میں مصنف کو داخلی زندگی اور داخلی کرب کا مسئلہ بھی درپیش رہتا ہے اور یہاں تک سائنس کی پہنچ مشکل ہے۔

پروفیسر احتشام حسین نے ادبی تنقید کے سلسلے میں ایک جگہ لکھا ہے:۔

''ادبی تنقید میں تشبیہ و استعارہ صنائع معنوی اور لفظی کے مناسب استعمال کو بھی اہم مقام دیا ہے لیکن ان کے استعمال کی ادبی اہمیت کیا ہے، ان سے تاثر میں کس طرح اضافہ ہوتا ہے، ان سے ادبی حسن کس طرح پیدا ہوتا ——— ان باتوں کی طرف توجہ نہیں کی

---

(۱) ''تنقید و تجزیہ''، کتابستان، الہ آباد

جاتی۔ صنائع کے نفسیاتی محرکات اور اثرات پر غور کیے بغیر انہیں تنقید میں عملی طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جیسے ہی تشبیہ اور استعارے کے نفسیاتی پہلوؤں پر نگاہ ڈالی جائے گی موضوع، مواد، خیال کی حقیقت، اہمیت اور نوعیت کی بحث شروع ہو جائے گی اور ادبی تنقید خالص ادبی تنقید نہیں رہ جائے گی۔ جیسے ہی یہ سوال پوچھا جائے گا کہ صنائع میں وہ جمالیاتی پہلو کس طرح پیدا ہوتا ہے جو ادبی لطف اندوزی میں اضافہ کرتا ہے بحث فلسفہ کی سرحد میں داخل ہو جائے گی اور صنائع صرف ادبی ذریعہ اظہار نہیں رہ جائیں گے۔"(۱)

ادبی تنقید کو اس کے وسیع تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ اس میں معاشی اور معاشرتی قوتوں کی شناخت بہت اہم ہے، مگر اس سے ادیب کی انفرادیت اور شخصی ذہن کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ ادب سے متعلق فیصلہ کرنے سے پہلے ادیب کی شخصیت کے مختلف زاویوں اور گوشوں کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ادبی تنقید کا راستہ بالکل سیدھا سادہ نہیں ہے، اس راستے پر صحیح طور پر گامزن رہنے کے لئے ہمیں دوسرے علوم سے بھی واقفیت رکھنا ہوگا۔

تنقید کو تہذیب عطا کرنے میں زبان کے استعمال کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ تنقید کی زبان کے تعلق سے ایک عام خیال یہ ہے کہ یہ سادہ، سلیس، دوٹوک اور سائنٹفک ہونی چاہیے۔ شاعرانہ رنگ سے عاری اور انشائیہ پردازی سے مبرا ہونی چاہیے —— حالؔی سے پہلے بھی اردو میں ایک امتیازی کیفیت کے ساتھ تنقیدی شعور کی مختلف روئیں ملتی ہیں۔ مگر ایک باقاعدہ صنف

---

(۱) "ادبی تنقید: قدر و معیار کا مسئلہ" مشمولہ: "تنقیدی نظریات" حصہ دوم، ص ۲۸۵

ادب کی حیثیت سے تنقید کی معیار بندی کی حالیؔ سے پہلے کوئی واضح روایت نہیں ملتی ہے۔ اس کے بعد ہی تنقید کی ادبی حیثیت مسلمہ طور پر ہمارے سامنے آئی۔ یہاں دیگر تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس میں دو رائے کی گنجائش ہی نہیں کہ تنقید کو بھی ادب کا ایک قابل لحاظ بلکہ وقیع حصہ مان لیا گیا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ادب کے اس حصے یا جزو کے سلسلے میں بات کرنی ہو تو ادب کی تمام خصوصیات، لوازمات، معنیٰ و مفہوم کا جس سے ادب عبارت ہے، اس حصے پر بھی کسی نہ کسی تناسب سے مگر ضرور اطلاق ہوگا۔ دراصل میں یہاں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تنقید کسی کیمیاوی یا طبعی سائنس کی طرح اس قدر خالص، سائنٹفک نہیں ہو سکتی جس قدر اس بارے میں خیال کیا جاتا ہے، کیونکہ ادب خود بڑی حد تک ایک غیر سائنٹفک اور پیچیدہ تخلیقی عمل کا نتیجہ ہے جس میں عقلی اور وجدانی، مادی اور روحانی، ارادی اور غیر ارادی، جدلیاتی اور نفسیاتی ارتعاش کا مرئی اور غیر مرئی قابل گرفت اور نا قابل گرفت پیچ در پیچ سلسلہ ملتا ہے۔ تنقید بھی اسی ادب کا ایک حصہ ہے اور اس کی زبان اظہار اور ابلاغ کے سلسلے کا ایک ایسا آہنگ ہے جسے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ لہٰذا تنقید کی زبان کے سلسلے میں یہ اصول مرتب کرنا کہ یہ دو اور دو چار کی طرح ہے نامناسب بلکہ غیر صحیح ہے۔

تنقید کے سلسلے میں یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ یہ آرٹ ہے یا کرافٹ یا محض ایک تکنیک ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ یہ سوچیں یا کہیں کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ محض فوٹو گرافی کا فن نہیں ہے۔ یا کچھ لوگ کہیں کہ ادب زندگی کی چلتی پھرتی تصویر ہے، کوئی پینٹنگ نہیں۔ اس سلسلے میں گر ہم بحث کو طول دیں تو دو مثبت اور دو منفی پہلو سامنے آتے ہیں۔ جہاں تک مثبت پہلو کا تعلق ہے ادب زندگی کا آئینہ ہے اور ادب زندگی کی چلتی پھرتی تصویر ہے اور منفی پہلو یہ کہ ادب نہ فوٹو گرافی کا فن ہے اور نہ ہی پینٹنگ ہے۔ چنانچہ یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ادب آرٹ ہے کرافٹ نہیں۔ لیکن جہاں تک میرا ذہن جاتا ہے میں ادب کو آرٹ بھی تسلیم کرتی ہوں اور کرافٹ بھی، یعنی فوٹو گرافی بھی اور پینٹنگ بھی۔ اس بارے میں جناب ابوالفیض سحر کا خیال

ملاحظہ کیجئے:۔

''فوٹو گرافی کے فن کی جو کوتاہی، خامی یا سقم ہے وہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ کیمرہ کی آنکھ نے جو دیکھا، جیسا دیکھا ویسا ہی قلم بند کیا۔ جہاں تک ادیب کے زاویہ نگاہ اور عمیق فکر و نظر کا تعلق ہے وہ اس قدر وسیع، ہمہ گیر، گہرا اور بلند آہنگ ہوتا ہے کہ تشریحات و توضیحات کے دفتر کھول دیجئے اور اس طرح کی کوتاہی، خامی یا سقم پینٹنگ سے ہی منسوب ہے وہ یہ کہ پینٹنگ خواہ کتنی ہی رنگین، دلچسپ اور خوبصورت کیوں نہ سہی باریک رنگی اور فنیج ہی سہی مگر اس میں محض ایک تخیل ہے...... جب کہ ادب چلتی پھرتی زندگی کی طرح متحرک رواں دواں، رنگا رنگ اور متنوع ہوتا ہے مگر اس سلسلے میں کچھ دلائل نہ دیتے ہوئے اگر میں اتنا بھی اشارہ کرتا چلوں تو کافی ہوگا کہ محاکات نگاری، مرقع نگاری، منظر کشی اور فضا بندی بھی ادب کی خصوصیات ہیں تو پھر ادب فوٹو گرافی کا فن بھی ہے اور پینٹنگ بھی ہے۔''(۱)

تنقید میں توازن کی اہمیت بھی تسلیم شدہ ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ توازن تہذیب کی علامت ہے۔ یہ زندگی کو پر وقار، شخصیت کو عظیم اور ذات کو ارفع و اعلیٰ بناتا ہے۔ اگر آرٹ و ادب میں توازن نہ ہو تو آرٹ اور ادب دونوں بے وقعت و بے مایہ نظر آئیں گے۔ توازن میں وزن اور وقار اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس عمل میں تنقیدی شعور بھی کارفرما ہو۔ تنقید، تضحیک و تنقیص کا نام نہیں ہے اور نہ ہی تعریف و توصیف کا فن ہے۔ بلکہ یہ وصف و نقص اور

---

(۱) ''زبان و ادب''، پٹنہ، اپریل ۱۹۷۶ء، ص ۵۵

محاسن ونقائص دونوں کی نشاندہی کرنے اور فن کار کے ذہن وشعور تک رسائی حاصل کرنے کا فن ہے۔ یہ ایک ایسی کسوٹی ہے جس کے ذریعہ کھرے اور کھوٹے کی پہچان کی جاتی ہے۔ لہٰذا اس نقطہ نظر سے تنقید میں توازن کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ عدم توازن کی صورت میں اچھی اور کامیاب تخلیق ناممکن ہے۔ اعلیٰ اور صحت مند تنقید کا قیاس اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ نقاد کی شخصیت متوازن نہ ہو۔ بقول ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی :-

> ''جدید اردو ادب میں جو اختلال وانتشار پیدا ہوا ہے اور اس کی صحیح سمتیں متعین نہ ہوسکیں، اس کی وجہ ہمارے یہاں متوازن اور ہمہ گیر شخصیت رکھنے والے نقادوں کی کمی ہے۔ پرانے نقاد نئے ادبی تقاضوں کو پورے طور پر نہ سمجھ سکے اس لئے یا تو وہ نئے ادب کی مخالفت کرتے رہے یا خاموش رہے اور بعض نئے اصناف اور ہیئتوں کا شعور نہیں رکھتے تھے۔'' (۱)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ خلیل الرحمن اعظمی کے نزدیک نقاد کی شخصیت متوازن اور ہمہ گیر ہو تو صحت مند تنقید کا وجود ممکن ہے۔ بصورت دیگر وہ رطب ویابس میں فرق نہیں کرتا اور یا تو انتہا پسندی میں مبتلا ہوجاتا ہے یا پھر جانبداری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اگر اردو تنقید کے سرمائے کی چھان بین کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے بیشتر نقاد نکتہ چینی سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔ اور اگر بڑھے ہیں تو انتہا پسندی اور جانبداری کا شکار ہوگئے ہیں۔ محمد حسین آزادؔ کے خیالات ذوقؔ کے متعلق، عبدالرحمن بجنوریؔ کے خیالات غالبؔ کے متعلق اور کلیم الدین احمد کے خیالات ''گل نغمہ'' کے متعلق اس کے ثبوت کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔ اس باب میں مولانا حالیؔ کا نام ہی قابل ذکر ہے کہ ان کی تنقید صاف اور سلجھی ہوتی ہے۔ مولانا حالیؔ نے تنقید میں

(۱) ''زاویہ نگاہ''، خلیل الرحمن اعظمی

توازن کی اہمیت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور پہلی بار تنقید کی ایک صحت مند مثال سامنے آئی۔ ان میں اگر تھوڑی بہت کمی تھی تو وہ یہ کہ حالی فن تنقید سے بہ خوبی آگاہ نہ تھے۔ انگریزی تنقید سے بھی ان کی بس واجبی واقفیت تھی۔ اگر یہ دونوں چیزیں ان میں موجود ہوتیں تو آج تنقید کا سرمایہ زیادہ وقیع ہوتا۔ ان محدود اجزاء کے عدم توازن کے سبب ایک طرف تو حالی کے تنقیدی خیالات محدود ہو گئے دوسری طرف انہوں نے قدم قدم پر اخلاق کی تلقین کی ہے۔ حالی کے شانہ بہ شانہ یا ان کے بعد آنے والے نقادوں میں یقیناً ایسے ناقدین کی کمی ہے جن کے یہاں شخصیت کا توازن، فکر کی گہرائی اور ناقدانہ بصیرت ملتی ہو۔ ورنہ اکثریت ایسے نقادوں کی ہے جنہوں نے تنقید کو جانبداری کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ سستی شہرت کے حصول اور اپنی ہمہ دانی کے ثبوت کے لئے اہم اور قابل قدر شعری کارناموں میں مصائب اور نقائص کی تلاش کو اپنا شیوہ بنا لیا۔ نتیجے کے طور پر بحیثیت نقاد وقت نے ایسے لوگوں کی اہمیت تسلیم کرنے سے آج انکار کر دیا ہے۔

ادب میں اظہار و ابلاغ کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ اظہار و ابلاغ کی ترسیل فن کار کی پہلی اور آخری کوشش ہوتی ہے، لہٰذا یہاں بھی توازن شرط اول ہے۔ یہاں توازن سے میری مراد موضوع کے مطابق انداز و اسلوب کا اختیار کرنا ہے۔ اگر موضوع عالمانہ ہے اور اسلوب ہلکا پھلکا، لچر یا رنگین و مزاحیہ ہے تو تنقید بے وزن و بے وقار ہو جاتی ہے۔ محمد حسین آزاد نے اس قسم کی غلطی کی ہے اس لئے ان کا شمار نقادوں میں ہونے کے بجائے تذکرہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ کلیم الدین احمد نے آزاد کی اس کمزوری پر یوں روشنی ڈالی ہے:۔

> ''عبارت آرائی کی جستجو میں مقصد فراموش ہو جاتا ہے اور اس عبارت آرائی سے کچھ حاصل بھی نہیں ہوتا، تنقید کی زبان سیدھی سادی ہوتی ہے، صاف اور معین ہوتی ہے۔ تنقید میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ زبان کی سلاست اور روانی، رنگینی اور جلا

خیالات پر پردہ نہ ڈال دے۔ آزاد اس قسم کی غلطی کرتے ہیں۔
ان کی عبارت آرائی دو خامیوں کا سرچشمہ ہے۔ ایک خامی تو یہ ہے
کہ نقاد اپنے موضوع کو پس پشت ڈال کر الفاظ کے حسن اور
عبارت کی رنگینی میں جا پھنستا ہے اور دوسری خامی یہ ہے کہ اس قسم
کے اسلوب میں خیالات اور ان کے مختلف پہلوؤں کو صاف، محکم
اور معین طور پر بیان کرنا ناممکن ہو جاتا ہے 'آب حیات' میں یہ
دونوں خامیاں موجود ہیں۔"(۱)

آزاد کی اس بے اعتدالی کو کلیم الدین احمد نے ہی نہیں دیگر ناقدین نے بھی Point Out کیا ہے۔

ایک اچھے نقاد کے لئے ایک اچھا اور صاحب طرز نثر نگار ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ اگر وہ اچھا نثر نگار نہیں ہے تو اپنے خیالات کو واضح، مستنبط اور معین طور پر پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ پیش کش کی خامی اور ترسیل کے نقص کے سبب اس کی تنقید بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ دوسری منزل اصول نقد کی ہے، یعنی اصول نقد محکم، پائیدار، متوازن اور اعلیٰ ہو تو بلاشبہ یہ ادب وفن کے سرمائے میں ایک اہم اضافہ ضرور ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ عارضی اور وقتی ہوگا، ابدیت اور دوامیت بہر حال اس وقت حاصل ہوگی جب اظہار اور اصول دونوں اہم اور بلند پایہ ہوں۔ دونوں کے اشتراک اور ہم آہنگی سے جو تنقید وجود میں آئے گی وہ یقیناً قابل قدر ہوگی۔ نقاد اگر الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھ کر رنگین اور مرصع طرز تحریر اختیار کرتا ہے تو اس سے اسلوب تنقید کا حق ادا نہیں ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اگر انداز بیان تیکھا، کرخت، سخت، حاکمانہ ہو تو یہ بھی تنقید کے لئے موزوں نہیں ہے۔ گویا طرز ادا اور اسلوب بیان میں بھی درمیانی راہ اختیار کرنا

---

(۱) "اردو تنقید پر ایک نظر"، کلیم الدین احمد، ۱۹۶۹ء، ص ۴۹

ضروری ہے اور یہی درمیانی راہ متوازن راہ ہوگی۔ اس طرح تنقید کے لئے توازن کی اہمیت مسلم ہو جاتی ہے۔ میرے نزدیک توازن اور تناسب کا بڑے فنکار میں عموماً اور ہر بڑے نقاد میں خصوصاً پایا جانا ضروری ہے۔

تنقید میں توزن واعتدال پر تفصیل سے بحث کی جا چکی۔ اب اس بات پر غور کرنا ہے کہ تنقید میں تحقیق کی کیا اہمیت ہے۔ اس بات پر غور کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کیا ہے؟

تحقیق کے لغوی معنی کسی شئے کی حقیقت کا پتہ لگانا ہے لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔ اس میں خون جگر صرف کرنا پڑتا ہے۔ محنت و مشقت اور صبر و شکیبائی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ جلد اکتا جانے والا انسان تحقیق کی راہ میں زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ اس لئے کہ حقائق کی تلاش بہت دشوار کام ہے۔ بعض حضرات تحقیق کو گورکنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ تحقیق ان کے نزدیک بیکار کام ہے۔ عہد حاضر کے ممتاز مزاحیہ شاعر رضا نقوی واہی نے محقق کا مذاق یوں اڑایا ہے:

ہیں بزعم خود محقق آپ ہندوستان کے
آپ نے نقطے گنے ہیں میر کے دیوان کے
کاتتے ہیں سوت کو تحقیق کے اتنا مہین
آپ کے آگے جلا ہے مات ہیں ایران کے
زیر تحقیق آپ کے رہتے ہیں یہ سب مسئلے
کس قدر چوہے پلے تھے گھر میں مومن خان کے
پانچ بج کر پانچ پر یا پانچ بج کر سات پر
داغ نے توڑا تھا دم زانو پہ منی جان کے
رند نے اک بے وفا کے عشق میں کھائے تھے جو
وہ چھری کے گھاؤ تھے یا زخم تھے کرپان کے

دھن ہے یہ ثابت کریں دلی ہے ملٹن کا وطن
اور سودا کے چچا بوچر تھے انگلستان کے (۱)

بقول ڈاکٹر شارب ردولوی :-

''اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ میر کہاں پیدا ہوئے، وہ اکبر آباد میں پیدا ہونے کے بجائے لکھنو میں پیدا ہوئے یا ان کے والد صوفی ہونے کے بجائے شاہی توشہ خانے کے داروغہ ہوتے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' (۲)

ڈاکٹر احسن فاروقی کے نزدیک تحقیق منشی گیری یا کلرکی ہے۔ وہ اسے نہایت حقیر اور کمتر درجہ کی چیز تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے:-

''تحقیق کی ایک قسم منشی گیری ہے۔ اس کے لئے وہ خصوصیات کافی ہیں جو کسی معمولی ذہن کے انسان میں ہوں۔ اس میں جدت طبع، قوت اختراع کی ضرورت نہیں، محض ایک کام سے لگ جانا ہے اور ٹکے بندھے طریقے پر ایک لکیر پر چلتے رہنا ہے پھر اس میں جس قسم کی محنت درکار ہے اس کو اعلیٰ ذہن اور اعلیٰ تخئیل رکھنے والا انسان کبھی بھی نہ قبول کرے گا تحقیق کے لئے مغز سگان کی ضرورت ہے جب کہ تنقید کے لئے مغز شاہان درکار ہے تحقیق کرنے والے کی حیثیت ایک مزدور کی سی ہوتی ہے جو اینٹیں اٹھا کر لاتا ہے اور ان کو جوڑ کر دیوار بناتا ہے۔'' (۳)

---

(۱) ''منظومات واہی''، رضا نقوی واہی، ص ۱۸

(۲) ''جدید اردو تنقید: اصول و نظریات''، شارب ردولوی۔ ۱۹۹۰ء

(۳) ''اردو میں تنقید''، ڈاکٹر احسن فاروقی، ص ۱۴۵

لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ تحقیق لگن، جستجو اور ارتکاز چاہتی ہے۔ اس کے بغیر معنی خیز نتائج برآمد ہو ہی نہیں سکتے ہیں۔ اکثر محققین تساہل اور کسل مندی کے سبب نتائج کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہوتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر تحقیق محض خوردہ گیری اور اعداد و شمار کا مجموعہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر شارب ردولوی:-

> ''انتہا پسندانہ رویوں کی بنا پر تنقید و تحقیق ایک دوسرے سے دور جا پڑیں۔ ایک محقق نے تحقیق کو ہی سب کچھ سمجھ لیا اور ایک نقاد نے تحقیق کو کار مغز شاہاں سمجھ کر تحقیق کی دیدہ ریزی اور جگر کاوی سے دامن چھڑا لیا۔ دراصل تنقید و تحقیق کو ہم معنی یا ایک دوسرے کے مترادف سمجھنا یا ایک دوسرے سے قطعاً بے تعلق سمجھنا غلط ہے۔ اس لئے کہ بغیر تنقیدی شعور اور تنقیدی بصیرت کے تحقیق مکمل نہیں ہو سکتی اور اگر کوئی تحقیق بغیر تنقیدی بصیرت کے ہے تو وہ معاشیات اور مالیات کے اعداد و شمار کی طرح ہوگی جس سے معنی خیز نتائج کی توقع نہیں کی جا سکتی۔''(۱)

اردو کے سربرآوردہ نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد تنقید کو تحقیق پر فوقیت دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> ''تنقید تحقیق سے قدر و قیمت میں زیادہ ہے۔ دیکھنے میں تحقیق کی راہ بظاہر زیادہ دشوار ہے اس میں ایسی مشکلیں سامنے آتی ہیں جو ہمت شکن ہوتی ہیں لیکن یہ مشکلیں محنت، صبر، دماغ سوزی، صرفہ وقت، عدم عجلت سے آسان ہو سکتی ہیں اور ہو جاتی ہیں۔ کم لوگ اس قسم کی

---

(۱) ''جدید اردو تنقید: اصول و نظریات''، شارب ردولوی۔ ۱۹۹۰ء، ص ۴۳۲

محنت کی طاقت رکھتے ہیں اور اس راہ کو دشوار گذار سمجھ کر اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ دوسری جانب تنقید کو رائے زنی کہا جاتا ہے جو ہر غیر ذمہ دار شخص آسانی سے کر سکتا ہے اس لئے لوگ اس طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں...... تنقید کی عدم موجودگی میں تحقیق غیر مفید ہوتی ہے اور تنقید بعض اوقات تحقیق کی کمی کی وجہ سے لغزش کر جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ تحقیق تنقید کی محدود مخصوص صورت ہے اگر اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تو تحقیق مفید ہو سکتی ہے لیکن عموماً تحقیق کو ایک علیحدہ فن یا علم خیال کیا جاتا ہے اور اس کو تنقید سے بھی اونچی جگہ دی جاتی ہے۔ اور لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ تحقیق کو تنقید سے الگ کر دیا جائے تو اس کی حالت اس گم کردہ راہ کی ہوگی جو کسی صحرا میں بھٹکتا پھرے اور جس کو اس کی خبر نہ ہو کہ وہ بھٹک رہا ہے۔''(۱)

اہل ادب کے درمیان شروع سے ہی تحقیق و تنقید کے باہمی رشتے سے متعلق بحث جاری رہی ہے۔ یہ سوال آج بھی اٹھایا جاتا ہے کہ کیا خالص تنقید لازمی طور پر اعلیٰ تحقیق نہیں ہے؟ کیا اعلیٰ ادبی تحقیق اپنی بلند ترین سطح پر تنقید سے مختلف رہتی ہے؟ ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میرا خیال یہ ہے کہ اعلیٰ تنقید لازمی طور پر اعلیٰ تحقیق بھی ہے اور اعلیٰ ادبی تحقیق لازمی طور پر تنقید سے مختلف نہیں رہتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ تنقید بغیر تحقیق کے بے معنی ہے اور تحقیق بھی تنقید کے بغیر غیر صحت مند ہے۔ ہندی کے مشہور محقق ڈاکٹر نگیندر نے تحقیق و تنقید کے باہمی رشتے اور اس کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

---

(۱)''اردو تنقید پر ایک نظر''، کلیم الدین احمد، ۱۹۵۷، ص ۱۲۶

"میں ایسے اعلیٰ درجے کے محقق کا تصور نہیں کر سکتا جس میں تنقیدی صلاحیت موجود نہ ہو...... لہٰذا اعلیٰ ادبی تنقید تحقیق کی بہترین شکل ہے۔ محقق کو اس اہم حقیقت کے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔" (۱)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی تحقیق و تنقید کے باہمی رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"......تنقید میں بھی تحقیق کے لئے کئی پہلو نکلتے ہیں اور تنقید کے لئے بھی تحقیق ایک لازمی سا عمل ہے۔ سان بوفن کے ساتھ فن کار کو بھی سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔ آئی۔ اے رچرڈ فن کے ساتھ قاری کے ذہن اور ماحول کو سمجھنے کی تاکید کرتا ہے۔ رابرٹس تو اس سے بھی آگے بڑھ کر خود ناقد کو بھی اس میں لے آتا ہے اور اس کی نفسیات شناسی کو ضروری قرار دیتا ہے۔ تان ساری اجتماعی تہذیب کے مطالعے کو اہمیت دیتا ہے اور ہر برٹ میولسر کے نزدیک تو زمانے کی مجموعی فکری روح کی شناخت بھی ضروریات تنقید میں شامل ہے۔ غرض کوئی سچی تنقید تحقیق سے آنکھ نہیں چرا سکتی اور صرف تاریخ ہی نہیں حیات انسانی کی پوری تاریخ اس کی لپیٹ میں آتی ہے۔ یہیں پہنچ کر تحقیق و تنقید ہم معنی سے الفاظ بن جاتے ہیں۔ کم از کم ان دونوں کی باہمی بے تعلقی کا دعویٰ غلط ہی ثابت ہوتا ہے۔" (۲)

---

(۱) "تحقیق و تنقید" (مقالہ) مطبوعہ: ماہنامہ "آج کل" دہلی، دسمبر ۱۹۶۴ء، ص ۱۲

(۲) "تنقیدی نظریات"، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۱۷۴

تنقید اور تحقیق سے متعلق اپنی گفتگو میں پروفیسر احتشام حسین کے اس خیال پر منتہی کر رہی ہوں۔ احتشام نے لکھا ہے:-

"...... ہمارے محققین اگر چہ پوری طرح ان نتائج پر نظر نہیں رکھتے اور اسی وجہ سے کبھی کبھی اہم اور غیر اہم میں امتیاز نہیں کرتے۔ تاہم مواد کی جستجو سے غافل نہیں۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مواد کا کھوج نکالنا ہی ان کے لئے مقصود بالذات بنتا جا رہا ہے۔ اور وہ اس کو تنقید اور تحقیق کا حریف بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ناتراشیدہ ہیرے کے ٹکڑے ہاتھ آ جانے سے اور اسے تراش کر کسی آوزاۂ گوش کے قابل بنانے میں جو فرق اور فاصلہ ہے اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔" (۱)

اس بحث کے بعد اب آیئے تنقیدی دبستان پر مختصر بحث کی جائے۔ اس کے قبل کہ تنقید کے مختلف دبستانوں کا مختصراً تعارف پیش کیا جائے یہ جان لینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دبستان کیا ہے؟ اور تنقید کے لئے دبستان کا کیا جواز ہے؟

پہلے سوال کا جواب بہت آسانی سے یوں دیا جا سکتا ہے کہ کسی بھی نظام فکر سے وابستہ افراد اور ان کی ذہنی کاوش دبستان سے تعبیر کی جا سکتی ہیں۔ دوسرے سوال کا جواب ڈاکٹر خورشید جہاں کی زبانی ملاحظہ کیجئے:-

"دراصل ادب مسلسل ارتقاء پذیر رہا ہے اور اس کی ارتقاء پذیری کے ساتھ ساتھ تنقیدی روش بھی بدلتی رہتی ہے۔ کبھی کوئی ایک خیال یا فکر کچھ لوگوں کے درمیان ابھر گیا تو کبھی کوئی دوسرا خیال اور

---

(۱) "عکس اور آئینے"، پروفیسر احتشام حسین، اکتوبر ۱۹۷۷ء، ص ۱۳۶

دوسرا نقطہ نظر کبھی کبھی ایک نقطہ نظر دوسرے نقطہ نظر کے متوازی بھی
چلا اور مخالف بھی اور اب نتیجے میں جو اسکول کی تشکیل ہوئی وہ بالکل
دو متضاد اسکولوں پر مبنی تھا۔ ادب کے مختلف دبستانوں کا جواز یہی
ہے۔" (۱)

ذیل میں تنقید کے چند اہم دبستانوں کا مختصر تعارف پیش کرنے کی سعی کر رہی ہوں۔

تنقید کی ابتدا میں دو قسمیں مشہور تھیں ایک نظری تنقید اور دوسری عملی تنقید، نظری تنقید میں اصول تنقید سے بحث کی جاتی ہے اور ایک ناقد کے تصور ادب اور نظریہ تنقید پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ جب کہ عملی تنقید میں ادب اور تنقیدی اصول و تصورات اور نظریات و افکار کا اطلاق ادبی تخلیقات کے نمونوں پر کیا جاتا ہے اور تجزیہ و تبصرہ کر کے بتایا جاتا ہے کہ یہ نمونے کن اوصاف اور اقدار و معیار کے حامل ہیں اور ادب میں ان کی کیا اہمیت و حیثیت ہے۔

انگریزی ادب میں عملی تنقید کا شعور سب سے پہلے ڈرائڈن کے یہاں ملتا ہے۔ پھر یہ سلسلہ جانسن، میتھیو آرنلڈ، کالرج اور ٹی. ایس. ایلیٹ سے ہوتا ہوا آئی. اے. رچرڈسن تک آتا ہے۔ رچرڈسن پہلا معروف انگریز نقاد ہے جس نے پہلی مرتبہ اس موضوع پر باضابطہ ایک کتاب "پریکٹیکل کریٹی سزم" (Practical Criticism) یعنی "عملی تنقید" تصنیف کی۔ اس کتاب میں باضابطہ طور پر عملی تنقید کی تعریف پیش کی گئی اور نمونے پیش کئے گئے۔

عملی تنقید میں سب سے پہلے حقیقی متن (Original Text) کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس کام کے لئے نقاد کے نزدیک دوسرے فن پاروں کے متون کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ مقابلے میں آسانی ہو سکے اور تجزیہ پیش کرنے میں بھی سہولت ہو نیز معنی اور مفہوم نکالنے میں بھی پریشانیوں کا سامنا نہ ہو۔ اس طرح عملی تنقید اپنے مطالعہ اور طریق کار کی نوعیت کے اعتبار سے

---

(۱) "جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات"، خورشید جہاں، ۱۹۸۹ء، ص ۴۷

ایک خالص تحلیلی اور تجرباتی طریقہ وتنقید ہے جس کا عمل پوری طرح فن اور ہیئت کے دائرے میں بروئے کار آتا ہے۔

تاریخی تنقید کا با قاعدہ آغاز فرانسیسی نقاد منڈ شیر سے تسلیم کیا جاتا ہے۔اس نے جب ملٹن کی Paradise Lost پر والٹر اور میکالے کی تنقیدی آرا کا مطالعہ کیا تو دونوں کے فیصلوں میں بُعد پایا۔اول الذکر نے اس کی دل کھول کر مذمت کی تھی تو ثانی الذکر نے اسے غیر مشروط طور پر سراہا تھا۔اس سے تنقید میں ایسے طریقے کی جستجو ہوئی جس کے ذریعہ ذاتی پسند وناپسند کو سمجھا تو جائے مگر ان پر فیصلہ صادر نہ کیا جائے۔

تخلیقی ادب میں مختلف قسم کے محرکات وعوامل کارفرما ہوتے ہیں اور ان محرکات وعوامل کے اشتراک سے تخلیق کار کے اندر ایک خاص انداز نظر جنم لیتا ہے ان محرکات وعوامل کی اہمیت وافادیت اور پھر ان کا تجربہ اہم تنقیدی مسائل میں سے ہے۔اس مقصد کی تکمیل کے لئے ادب اور ادیب پر تاریخی حالات وحوادثات کے اثات کا جائزہ لینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔تنقید میں تاریخی دبستان اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے وجود میں آیا۔تاریخی تنقید کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر یوں رقمطراز ہیں:۔

> ''تاریخی تنقید کی اس لحاظ سے بھی بے حد اہمیت ہے کہ اس نے پہلی مرتبہ ان سماجی عوامل، تاریخی محرکات اور نسلی اثرات کی اہمیت واضح کی جو کسی نہ کسی طرح سے ادیب کی شخصیت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتے اور اس کے تخلیقی شعور کے لئے مخصوص انداز میں سامان مہیج بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔''(۱)

میتھیو آرنلڈ نے تاریخی تنقید کے سلسلے میں نہایت متوازن رائے کا اظہار کیا ہے:۔

---

(۱) ''تنقیدی دبستان''، سلیم اختر ۱۹۸۲ء، ص ۴۱

''موجودہ دور میں تاریخی تنقید بہت اہم اور مشہور ہے۔ لیکن یہ سمجھ لینا کہ صرف ایسے مطالعہ سے ہی ادب کی درست تفہیم ہو سکتی ہے، خطرناک نظریہ ہے۔''(۱)

ادب میں تاریخی مطالعہ کا تصور اول اول افلاطون کے یہاں ملتا ہے اس نے اپنی کتاب Republic میں اس سلسلے میں تفصیلی باتیں کہی ہیں۔ افلاطون کے بعد ادب میں تاریخی تنقید کی اہمیت کا اندازہ ارسطو کے خیالات سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''بوطیقا'' (Poetic) میں اس سلسلے میں روشنی ڈالی ہے۔

دور جدید میں تنقید کے تاریخی نظریے پر سب سے زیادہ زور تین (Taine) نے دیا ہے۔ فلسفہ ادب اور تاریخ پر اس کی گہری دستگاہ تھی وہ سینٹ بیو کا شاگرد تھا۔ سینٹ بیو ابتدا میں رومانیت کا علمبردار تھا۔ بعدہٗ اس کے یہاں نفسیاتی طریقہ نقد نمایاں نظر آنے لگا۔ پھر وہ تاریخی تنقید کی طرف مائل ہو گیا۔

عمرانی تنقید ایک مخصوص سماج اور معاشرے سے وابستہ رجحانات کا تجزیہ ایک خاص عہد کے پس منظر میں کرتی ہے۔ اس عمل میں وہ سماج کے ہر اس شعبہ سے تعاون لیتی ہے جو کسی بھی لحاظ سے اس کے مطالعے میں نئی جہات کے اضافے کا موجب بن سکے۔

اردو تنقید میں عمرانی تنقید گرچہ باقاعدہ دبستان کی صورت میں نہیں ملتی ہے لیکن ادب پاروں کی تفہیم و تعین کے لئے سماجی محرکات کے مطالعہ پر زور دینے والے نقادوں کی کمی نہیں ہے۔ خصوصیت سے مارکسی نقادوں نے تو سماجی محرکات پر بھی خاصی بحث کی ہے۔ شروع میں ناقدین کا خیال تھا کہ عمرانی تنقید صرف افسانوی ادب کی تفہیم کے لئے ہی رہنما بن سکتی ہے۔ لیکن بعد میں یہ خیال غلط ثابت ہوا اور پتہ چلا کہ شعری تخلیقات کا بھی اس کی روشنی میں جائزہ

---

(۱) بحوالہ ''تنقیدی دبستان''، ۱۹۸۲ء، ص ۴۲

لیا جا سکتا ہے اور لیا گیا ہے۔

رومانی تنقید پر دیگر تنقید کے مقابلے میں بہت زیادہ لکھا گیا ہے۔ رومانی تنقید کا باوا آدم ورڈز ورتھ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسکے شانہ بشانہ کالرج کا نام بھی آتا ہے۔ ان دونوں کے اشتراک سے ۱۸۰۱ء میں Lyrical Sallads شائع ہوئی۔ اس کا پیش لفظ لکھتے ہوئے ورڈز ورتھ نے جن خیالات کا اظہار کیا، وہی دراصل رومانی تحریک کا منشور اور رومانی تنقید کی اساس قرار پائے۔ اس پیش لفظ میں شاعری سے متعلق اس کا یہ قول آج عالمگیر شہرت کا حامل ہے:

"Poetry is spontaneous overflow of powerful

feelings"

(شاعری قوی جذبات کے بے ساختہ سیلاب کا نام ہے)

نفسیاتی تنقید کا دبستان بہت قدیم نہیں ہے۔ نفسیاتی تنقید کے ذریعہ پہلی بار تخلیق کار کی نفسی اساس اور کرداری محرکات کی تلاش میں گہرائی اور ژرف نگاہی کے ساتھ ساتھ سائنسی بلکہ طبی نقطہ نظر کو بروئے کار لایا گیا اور یوں تنقید کی تاریخ میں پہلی مرتبہ تخلیق اور تخلیق کار دونوں کو نفسیات کی صورت میں ایک محدب شیشہ میں رکھ کر ان کی پیچیدگیوں اور باہمی اثر پذیری کا مطالعہ ممکن ہو گیا۔ نفسیاتی تنقید سے متعلق ڈاکٹر خورشید جہاں رقمطراز ہیں:۔

"نفسیاتی تنقید دراصل رومانی تنقید کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ رومانی تنقید نفسیاتی تنقید کا ہی ایک حصہ ہے۔ کیونکہ رومانی تنقید میں فنکار کے انفرادی جذبات وحسیات کو اہمیت دی جاتی ہے اور نفسیاتی تنقید میں نقاد فنکار کے افعال وخیالات کا اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں اتر کر مطالعہ کرتا ہے۔" (۱)

---

(۱) "جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات"، خورشید جہاں، ۱۹۸۹ء، ص ۵۶

اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ رومانی تنقید نفسیاتی تنقید کی ابتدائی شکل ہے کیونکہ نفسیات کا موضوع بہت وسیع ہے اور یہ تمام چیزوں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ بقول شارب ردولوی:-

"......رومانی تنقید کو نفسیاتی تنقید کا ایک حصہ قرار دینا یا نفسیاتی تنقید کو رومانی تنقید کی ایک ترقی یافتہ اور وسیع شکل کہنا غلط نہیں ہے۔" (۱)

جمالیاتی تنقید کی اصطلاح جس قدر مشہور ہے اسی قدر نئی بھی ہے۔ اس کا مقصد ادبی فن پاروں میں مسرت و حسن کے اجزاء کی تلاش ہے۔ جمالیاتی تنقید سے متعلق ڈاکٹر سلیم اختر کا بیان قابل قدر ہے:-

"جمالیاتی تنقید، تنقید کے دیگر دبستانوں سے اس بنا پر ممتاز ہو جاتی ہے کہ اس میں حسن اور حسن کاری کے مطالعہ کو تنقید کی اساس ہی نہیں تصور کیا جاتا بلکہ ان کے علاوہ اور کسی چیز کو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ اسی لئے تو ایک جمالیاتی نقاد ادبی تخلیقات میں حسن اور دلکشی پیدا کرنے والے خصائص کے تجزیہ اور محاکمہ ہی کو اولین اور اساسی اہمیت دیتا ہے۔" (۲)

دراصل جمالیاتی تنقید کی اساس ان مظاہر حسن کے ادراک پر مبنی ہے، جن کا ادب میں کسی نہ کسی ذریعے سے اظہار کیا جاتا ہے اور جن کی پرکھ میں ہی دراصل فن پارے کی شناخت کا راز مضمر ہے۔

تاثراتی تنقید کو الگ سے ایک دبستان کی شکل عطا کرنے میں امریکی نقاد جوئل سپنگاراں (Joal Spingaran) کا نام سب سے نمایاں ہے۔ بیشتر ناقدین نے تاثراتی تنقید کی اہمیت

---

(۱) "جدید اردو تنقید: اصول و نظریات"، شارب ردولوی۔ ۱۹۹۰ء، ص ۱۸۵

(۲) "تنقیدی دبستان"، ۱۹۸۲ء، ص ۷۶

کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ والٹر پیٹر کا خیال ہے کہ تاثراتی تنقید کو جمالیاتی تنقید کی غلو پسندی نے جنم دیا ہے۔ کلیم الدین احمد نے ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں فراقؔ گورکھپوری کی کتاب ''اندازے'' سے بحث کرتے ہوئے تاثراتی تنقید کی مخالفت کی ہے اور یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:-

''جو تاثراتی تنقید کو اصل تنقید سمجھتا ہے وہ صحیح معنوں میں نقاد نہیں ہو سکتا۔''(۱)

اردو تنقید میں تاثراتی تنقید کی جھلکیاں جابجا دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اردو میں داد دینے کی روایت شروع سے ہی ملتی ہے۔ اس روایت کا سلسلہ دراصل مشاعروں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے اثرات تذکروں میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں اور ناقدین بھی اس کے اثرات سے بچ نہیں پائے ہیں۔ حتیٰ کہ حالیؔ اور شبلیؔ کے یہاں بھی اس کے اثرات جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے یہاں بھی داد دینے کی روایت نظر آتی ہے۔ ان کے بعد سب سے زیادہ جن نقادوں کے یہاں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے ان میں امداد امام اثر، مہدی افادی اور عبدالرحمٰن بجنوری کے نام نمایاں ہیں۔

تاثراتی تنقید کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں ادبی تنقید کے بنیادی مقصد یعنی ادب میں تعین قدر کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اگر ادب کو محض تفنن طبع کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اس سے اخذ تاثر کی توقع رکھی جائے تو پھر تاثراتی تنقید اپنے وجود کا جواز مہیا کر دیتی ہے۔

سائنٹفک تنقید ادبی تخلیقات اور فن کار سے متعلق تمام مباحث کو اپنے اندر سمو لیتی ہے اور جمالیاتی، نفسیاتی، سماجی اور مروجہ خیالات کی روشنی میں فنی تخلیق کا پتہ لگاتی ہے۔ یہ نظریہ تنقید ادب کی تخلیق کو مخصوص تاریخی اور مادی حالات کی پیداوار سمجھتا ہے۔ وہ مظاہر کے تجزیے میں

---

(۱)''اردو تنقید پر ایک نظر''، کلیم الدین احمد، ۱۹۵۷ء، ص ۳۵۴

اندرونی کشمکش، ارتقا اور حرکت پر نظریں جماتا ہے۔ وہ ادب کو جماعتی سمجھتا ہے، مواد اور ہیئت، تقسیم اور امتیاز کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ ادب میں جمود پرستی کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور نئے نئے تجربات کو ادب کی صحت مندی کے لئے ضروری تصور کرتا ہے۔ بقول پروفیسر احتشام حسین :-

> ''سائنٹفک نقطہ نظر وہ ہے جو ادب کو زندگی کے معاشی، معاشرتی اور طبقاتی روابط کے ساتھ متحرک اور تغیر پذیر دیکھتا ہے یہ ایک ہمہ گیر نقطہ نظر ہے اور ادبی مطالعے کے کسی اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔'' (۱)

اس قول سے سائنٹفک تنقید کی وسعت کا پتہ چلتا ہے اس لئے کہ اس میں معاشی، اقتصادی اور طبقاتی روابط بھی آجاتے ہیں اور ادبی مطالعے کے دوسرے اہم پہلو بھی سمٹ آتے ہیں۔ اس طرح سائنٹفک تنقید فنکار کی شخصیت اور اس کی تخلیق کا مطالعہ اس کی ادبی، جمالیاتی، لسانی اور فنی خصوصیات کے پیش نظر کرتی ہے۔ اس کے علاوہ فن کار کے ماحول، سیاسی وسماجی حالات وغیرہ کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کرتی ہے۔

مارکسی تنقید ان امور کا جائزہ لیتی ہے جن کی بنا پر معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے، اور ان محرکات کا تجزیہ بھی کرتی ہے جو اسے ایک مخصوص رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ مارکسی تنقید کو بعض ناقدین سائنٹفک تنقید بھی کہتے ہیں کیونکہ سائنٹفک تنقید کی جو تعریف کی جاتی ہے وہی تعریف کم وبیش مارکسی تنقید کی بھی ہے۔ مارکسی تنقید میں ادب زندگی اور معاشرے کے مادی ارتقاء میں شریک کار ہونے کے ساتھ ساتھ اس ارتقا کے مختلف مدارج کا عکس بھی پیش کرتا ہے۔ اس تنقیدی نظریے کے مطابق ادب برائے ادب کا نظریہ غلط، گمراہ کن اور مریضانہ ذہنیت ہی کا پروردہ نہیں بلکہ غریب عوام کے استحصال میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔ ادب

---

(۱) ''تنقیدی نظریات''، احتشام حسین، ص ۱۴۵

برائے زندگی اور ادب میں مقصدیت پر جتنے شد و مد سے اس نظریہ تنقید نے زور دیا ہے شاید ہی اس سے پہلے اور اس کے بعد کسی دوسرے دبستان نے دیا ہے۔

اوپر میں نے عملی، تاریخی، عمرانی، رومانی، نفسیاتی، جمالیاتی، تاثراتی، سائنٹفک اور مارکسی نظریہ تنقید کا مختصراً جائزہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ یہاں تنقید کے دیگر دبستان مثلاً ہیئتی، ادبی، معروضی، تقابلی، عصری، اسلوبیاتی، ساختیاتی، تشریحی، نظریاتی وغیرہ تنقیدی دبستانوں کے جائزے سے صرف نظر کر رہی ہوں کیونکہ ان دبستانوں کے مختصر ترین جائزے کے لئے بھی بیسیوں صفحات درکار ہوں گے اور صفحات کی تنگ دامانی اس کی اجازت نہیں دیتی۔

***

اردو ادب میں تنقید کی روایت

اردو ادب میں تنقید کا آغاز یوں تو ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ یعنی ۱۹۳۶ء سے مانا جاتا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں تنقید کے آثار تقریباً ایک صدی قبل سے ہی نظر آنے لگے تھے، یعنی الطاف حسین حالیؔ اور نواب امداد امام اثرؔ کی پیش کردہ تخلیقات و نگارشات سے ہی تنقیدی روایات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے لیکن اس کی صحیح شکل و صورت ۱۹۳۶ء کے بعد ہی سامنے آ سکی۔ حالیؔ اور اثرؔ سے بھی قبل نظریاتی تنقید کے واضح نشانات و اشارات ملتے ہیں۔

اس طرح نظریاتی تنقید کا باضابطہ آغاز مشہور یونانی فلاسفر افلاطونؔ (۳۴۷ تا ۴۲۷ ق م) سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ افلاطونؔ، سقراطؔ کا شاگرد اور ارسطوؔ کا استاد تھا۔ افلاطونؔ نے اپنے اسکول اکیڈمی میں رہ کر تیس سے زیادہ مکالمات قلم بند کیے۔ ان میں فیڈرس (Phaedrus)، ایون (Ion) اور ریپبلک (Republic) میں اس کے تنقیدی خیالات پائے جاتے ہیں۔ ادب اور افادیت اور ادب اور مقصدیت کے گہرے رشتے کو واضح کرنے کی وجہ سے افلاطونؔ کے تنقیدی خیالات کا مطالعہ دور جدید میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ جس طرح حالیؔ نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں اس دور کی شاعری خصوصاً غزل پر اعتراضات کیے، افلاطونؔ نے شاعری اور شاعروں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں انتہا پسندانہ رویے سے کام لیا

گیا ہے۔ لیکن وہ عظیم اخلاقی قدروں سے بھرپور شاعری کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے۔ حالیؔ نے بھی حالات سے مجبور ہو کر شاعری اور شاعروں پر سخت تنقید کی ہے۔ ''مسدس حالی'' میں حالیؔ نے اس دور کو خصومت میں سنڈاس سے بھی خراب بتایا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ قیامت کے دن سب بخش دیئے جائیں گے لیکن شاعروں کی بخشائش نہیں ہوگی۔ ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں غزل کو لائق گردن زدنی قرار دیا لیکن دراصل حالیؔ صنف غزل کے مخالفوں میں نہیں تھے بلکہ مضامین غزل کے خلاف لکھ رہے تھے۔ حالیؔ غزل کو سماجی، سیاسی اور اخلاقی زیورات سے مزین و آراستہ دیکھنا چاہتے تھے۔ حالیؔ چونکہ خود شاعر تھے اس لئے اعلیٰ شاعری کے مرتبہ و منصب پر پہنچنے کے لئے راہ عمل متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ افلاطونؔ خود بھی شاعر تھا اس لئے وہ عظیم شاعری کا دل سے قدرداں تھا۔ ''پروتو گورس'' نامی مکالمہ میں اس نے کہا ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کو محض ادب اور شاعری پر ہی بحث کرنے پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ حقیقت کی تلاش میں تمام تر ذہنی آزادی کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ دراصل شاعری میں تمام علم اور تمام حقیقتیں نہیں سما سکتیں۔ علم اور حقیقت کا بیان شاعری میں رمزیہ اور اشاراتی زبان میں ہوتا ہے۔ ''ریپبلک'' میں اس نے شاعروں سے کہا ہے:۔

> ''شاعری کو لذت و خوشی حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ تمام قوم، ملک و سماج کے لئے کارآمد اور مفید شکل میں پیش کیا جائے۔'' (۱)

افلاطونؔ کے خیالات و نظریات سے متاثر ہونے والے فلسفیوں میں ارسطوؔ، کانٹ، ہیگلؔ، نطشےؔ، برگساںؔ، شوپنہارؔ، روسوؔ اور مارکسؔ اہم ہیں۔ فرائیڈ نے بھی اس کے خیالات و نظریات سے استفادہ کیا ہے اور اس طرح تنقید کا کارواں دھیرے دھیرے آگے کی طرف گامزن رہا ہے۔ مارکسؔ نے ہیگلؔ کے نظریہ جدلیات کو درست قرار دیا لیکن دوسرے ہی طور

---

(۱) ''ریپبلک''، جلد ۱۰، ص ۶۰۸

پر۔ ہیگل کا خیال تھا کہ تاریخی قوتیں خصوصی حیثیت رکھتی ہیں، افراد اور واقعات تاریخ کے محض آلہ کار ہوتے ہیں۔ تاریخی قوتیں منطقی اعتبار سے ہمیشہ اپنا سفر آگے کی طرف جاری رکھتی ہیں۔ یہ سفر ایک سیدھی لکیر یا خط مستقیم پر نہیں ہوتا۔ تہذیب زوال پذیر بھی ہوتی ہے اور اس کا عروج بھی ہوتا ہے۔ مگر ہر صورت میں وہ ترقی کی سمت ہی گامزن رہتی ہے۔ مارکس نے ادب برائے ادب کی مخالفت کی۔ یہ نظریہ وہاں پیدا ہوتا ہے، جہاں فنکار اپنے ماحول اور معاشرہ سے مطمئن نہیں ہوتا۔ کسی شئے یا کسی واقعہ سے متاثر ہو کر انسان کو مسرت کا احساس ہوتا اور وہ اس شئے کو حسین سمجھتا ہے لیکن در حقیقت کون سی شئے یا کون سا واقعہ اسے مسرت پہنچاتا ہے اس کا انحصار اس وقت یا اس وقت کے ماحول پر ہے۔ اس شخصیت کا ماحول اور ذوق کیسا ہے۔ ہر شئے کا وجود آزادانہ طور پر اور انسانی ذہن میں خارجی طور پر موجود ہوتا ہے۔ حسن و مسرت کا تعلق انسانی فطرت سے جڑا ہوتا ہے کہ وہ خارجی اشیاء میں سے کسے حسین اور مسرت کا باعث سمجھتا ہے۔ اس لئے مختلف طبقات اور مختلف افراد کا ذوق حسن و مسرت سے مختلف ہوتا ہے۔ انسان ساری طاقتوں کو بدلتا ضرور ہے لیکن ان طاقتوں کے بدلنے میں وہ خود بھی بدلتا ہے۔ ادب کا زندگی سے گہرا ربط ہوتا ہے۔ ادب زندگی کے تقاضوں کو کھول کر بیان کرتا ہے یہ جدو جہد پر یقین رکھتا ہے اور اس لئے بہتر انسان اور بہتر انسان کی تخلیق میں اپنی سطح سے مدد و معاون ہوتا ہے۔ تضاد کی کشمکش کے بعد جو ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے وہ ہمیشہ برقرار نہیں رہتی، بلکہ اس ہم آہنگی کے بطن سے پھر دوسری کیفیت جنم لیتی ہے جس میں پھر اس کا تضاد پیدا ہوتا ہے۔ ان متضاد اشیا میں پھر تصادم ہوتا ہے اور اس سے پھر ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اور اس طرح یہ عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ ہم آہنگی کے ذریعہ ہی تاریخ کی سمت و رفتار تعین کی جاتی ہے۔ ہیگل کا خیال تھا کہ افلاطون نے اپنے مکالمات میں اس نظریے کو بنیاد بنایا تھا۔ اس لئے اس نظریے کا نام منطق (Dialectic) رکھا۔ ہر فلسفہ حقیقت کا جزوی طور پر بیان ہوتا ہے اور اس کا متضاد فلسفہ سچائی کا دوسرا جزو ہے۔ کل طور پر کوئی مسئلہ کبھی حل نہیں ہوتا مگر اضافی اعتبار سے

ہر مسئلہ حل ہوتا رہتا ہے۔ سماجی قوتیں اس کا قانون اخلاق اور مذہب وادب اس اندرونی تضاد کے تحت نئی شکل میں اپنا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ہیگل کا خیال ہے کہ سماجی وتہذیبی ارتقاء کی یہ ترقی خیال کی منت پذیر ہے۔ یہ ذہنی تصادم، روایت و بغاوت میں ہمیشہ ہوتا آیا ہے اس لئے اس نظریے کو جدلیاتی عینیت (Dialectical Idealism) کہا جاتا ہے۔ مارکس نے اپنے نظریے کو جدلیاتی مادیت (Dialectical Materialism) کہا ہے۔ اس کے نزدیک جو تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ ذہنی نہیں بلکہ مادی تبدیلی ہوتی ہے۔ اور جو قوتیں تبدیلیاں پیدا کرتی ہیں وہ سیاسی نہیں بلکہ اقتصادی ہوتی ہیں۔ سیاست، اخلاق، مذہب اور قانون اس تہذیبی عمارت کا بالائی حصہ ہیں۔ اس کی بنیاد معاشی واقتصادی قوتوں پر مبنی ہے۔ جاگیردارانہ نظام نے اپنے تضاد و سوشلزم کو جنم دیا اور ان دونوں کے تصادم سے اشتراکیت کا وجود عمل میں آیا۔ تاریخ میں ہونے والی جنگیں، ملکوں اور افراد کی جنگیں نہیں ہیں بلکہ یہ طبقاتی جنگیں ہیں۔ ایک وہ طبقہ جو پیداوار کے ذرائع اور ان کی تقسیم پر قابض ہوتا ہے دوسرا وہ طبقہ جو ان ذرائع سے محروم ہوتا ہے۔ اس طبقاتی جنگ کا خاتمہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب غیر طبقاتی سماج قائم ہو جائے۔ فنکار کا فرض ہے کہ وہ زندگی کی مادی اور ٹھوس حقیقتوں کو نہ صرف پیش کرے بلکہ ان کو اس طور پر بدلنے کی کوشش کرے جس سے مادی خوش حالی مساویانہ طور پر لوگوں کو مل سکے۔

اردو تنقید کی ابتدا صحیح معنوں میں حالیؔ کی ''مقدمہ شعر وشاعری'' سے ہوتی ہے۔ اس کتاب میں شاعری کی ماہیت اور اصول شعر سے بحث کی گئی ہے۔ متعدد سوالات اٹھائے گئے ہیں اور ان کے ذریعہ شعر وادب کے مختلف پہلوؤں کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ انہیں موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اسے اردو تنقید میں مستقل حیثیت حاصل ہے۔ حالیؔ ''مقدمہ شعر وشاعری'' کے ذریعہ ایک ایسا شعری نظام مرتب کرنا چاہتے ہیں جو وقت کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکے اور شاعری کے مزاج سے بھی الگ نہ ہو۔

امداد امام اثرؔ حالیؔ کے ہم عصر ہیں۔ انہوں نے لگ بھگ اسی زمانے میں اپنی کتاب

''کاشف الحقائق''، لکھی، اس کتاب میں شعروادب سے متعلق دلچسپ مباحث اٹھائے گئے ہیں اور مشرق ومغرب کے ادب کا ایک دلکش موازنہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اثر نے ادب کی دوسری اصناف سے بھی اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

حالی کے معاصرین میں شبلی نعمانی کا نام بھی اردو تنقید میں ایک اہم نام رہا ہے۔ شبلی نے اردو تنقید کو مخصوص رنگ وآہنگ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے اور ہماری ادبی روایت میں ایک نئے رجحان کا اضافہ بھی کیا۔ انہوں نے حالی کی طرح جدید خیالا ونظریات کا اتنا پرچار نہیں کیا۔ شبلی کے بغیر اردو تنقید مکمل نہیں کہی جاسکتی۔

حالی ہی کے زمانہ میں محمد حسین آزاد کا نام بھی آتا ہے۔ انہوں نے خود اپنے بارے میں کہا تھا کہ میرا نام نقاد کی حیثیت سے زندہ رہے نہ رہے، تذکرہ نگار کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ انہوں نے کہا تھا کہ جدید علوم کے خزانے کی کنجی انگریزوں کے قبضے میں ہے۔ آزاد تک آتے آتے اردو تنقید جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی گئی۔ بقول احتشام حسین:۔

> ''تنقید کا وجود عملی دنیا میں ایک فن کی حیثیت سے بہت قدیم ہے، جو سماجی ضرورتوں اور تقاضوں کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔ اس کی تاریخ انسانی شعور میں اسباب وعلل تلاش کرنے اور حکیمانہ انداز نظر پیدا کرنے کی عام تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ آج کے تقاضوں کی روشنی میں تنقید کے ایک جدید نقطہ نظر کی ضرورت ہے جس کے مبادیات پر نظر رکھنی ضروری ہے۔ نقاد کو فطری اور سماجی علوم، انسانی تمدن کی تاریخ، زبان کی پیدائش اور نشوونما کی تاریخ کا مطالعہ کئے بغیر تنقید کے میدان میں قدم نہ رکھنا چاہئے۔''(۱)

---

(۱) ''روایت اور بغاوت''، احتشام حسین، ۱۹۷۲ء، ص ۴۵

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ تنقید کے باب میں نقاد کا کیا کام ہے؟ میرا خیال ہے کہ نقاد کا اصل کام یہ ہے کہ وہ جب کسی فن پارے کا جائزہ لے تو پہلے مذاق و نظریاتی تعصبات سے اپنے ذہن کو پاک کر لے اور اس بات کو پیش نظر رکھے کہ تنقید اگر فن پارے کی جمالیاتی چکا چوندھ میں اضافے کا سبب نہ بن پائے تو اس کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ نقاد اپنے مطالعے میں اولین حیثیت فن پارے کو دے اور فن پارے کے اندر پوشیدہ امکانات کی روشنی میں اپنی تنقید کو بروئے کار لائے۔ ایک اعلیٰ فن پارہ محض ہموار سطح پیش نہیں کرتا اس کی متعدد عمودی اور افقی پرتیں ہوتی ہیں۔ چونکہ فن کار اور اس کی تخلیق میں روح اور جسم کا رشتہ ہے اس لئے فنکار اگر اپنے تخلیقی عمل میں کامیاب ہو جائے کو فن پارے میں اس کی ذات سما جاتی ہے اور اس کی ذات میں جو گہرائی یا وسعت ہے وہ بھی لامحالہ فن پارے میں منتقل ہو جاتی ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس سے فنکار کا نظریاتی جھکاؤ، مذہبی میلان، جمالیاتی ذوق نسلی سرمایہ سب کچھ فن پارے کے تار و پود میں شامل ہوتے ہیں۔ نقاد کا کام یہ ہے کہ وہ فن پارے کا اس کی اصلی اور واقعی صورت میں جائزہ لے اور اس میں جو نمایاں جہت اسے نظر آئے اس کا مطالعہ کرے نہ یہ کہ اپنے ذہن کی کسی جہت کو فن پارے میں تلاش کرنے کی سعی کرے۔ چنانچہ اگر کسی فن پارے میں اساطیری جہت نمایاں ہے تو بعض اشارات نقاد کو آرکی ٹائپل انداز تنقید کی طرف آمادہ کریں گے۔ اس طرح طبقاتی اشارات نمایاں ہیں تو مارکسی انداز تنقید کی طرف نقاد کی آمادگی ہوگی۔ مطلب یہ کہ تمثیل خود ہی اپنے پس منظر کے لئے ایک خاص طرح کا پردہ منتخب کرنے کی تحریک دے اور اس انتخاب کو ڈائریکٹر کی جوابدید پر نہ چھوڑے۔

محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی کے بعد جو نئی نسل سامنے آئی ان میں مولوی عبدالحق اور نیاز فتح پوری کا نام سب سے زیادہ اہم ہے۔

مولوی عبدالحق تحقیق اور تنقید دونوں میدانوں میں مشہور تھے اور دونوں میدانوں میں انہوں نے اپنا لوہا منوایا ہے۔ ان کی تنقید جمالیاتی یا تاثراتی تنقید کے دائرے میں آتی ہے۔

اس دائرے میں اور دوسرے نقاد بھی آتے ہیں جنہوں نے ادب میں اپنی جگہ بنائی ہے جیسے مہدی افادی، عبدالرحمن بجنوری، سجاد انصاری، اثر لکھنوی، فراق گورکھپوری، رشید احمد صدیقی، حسن عسکری وغیرہ۔ لیکن اس مختصر سے باب میں ان سبھوں کا احاطہ فرداً فرداً کرنا مشکل کام ہے۔

مولوی عبدالحق کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ "انتخاب کلام میر" ہے اس کا مقدمہ نہایت معرکہ آرا مقدمہ ہے۔ اپنے مقدمے میں انہوں نے میر کے تعلق سے لکھا ہے کہ:۔

"ان کا (میر کا) کلام اسی ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا جیسے سعدی کا کلام فارسی زبان میں پڑھا جاتا ہے۔ اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو میر کا نام اس میں ضرور شامل ہوگا۔ یہ ان لوگوں میں نہیں جنہوں نے موزونی طبع کی وجہ سے اپنا دل بہلانے کی خاطر یا دوسروں سے تحسین سننے کے لئے شعر کہے ہیں بلکہ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمہ تن شعر میں ڈوبے ہوتے ہیں اور جنہوں نے اپنے کمال سے اردو کی فضا کو چمکایا اور زبان کو زندہ رکھا۔" (۱)

اپنے مقدمے میں انہوں نے میر کی شاعری کے تمام پہلوؤں کا بھرپور خوبصورت انداز سے جائزہ لیا ہے۔ سچ یہ ہے اس مقدمے نے عبدالحق کی حیثیت اردو تنقید میں مستحکم کی ہے۔

نیاز فتح پوری کا مقام تاثراتی اور جمالیاتی نقادوں میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ نیاز فتح پوری نے مغربی علوم سے بہت کم فیض اٹھایا ہے اور عموماً خود کو مشرقی اصطلاحات تک محدود رکھا ہے اور اس روشنی میں فن پارے کو پرکھتے ہوئے اپنی پسند اور ناپسند کا بھی اظہار کیا

---

(۱) "انتخاب کلام میر" (مقدمہ)، مولوی عبدالحق، ص ۱۰

ہے، باوجود اس کے آج اردو تنقید میں نیاز فتح پوری کا نام بہت بڑا نہ ہی بہت اہم ضرور ہے۔
عبدالرحمٰن بجنوری بھی تاثراتی نقاد ہیں۔ انہوں نے ''دیوان غالب'' سے متعلق لکھا تھا:۔

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں 'وید مقدس' اور 'دیوان غالب'۔
لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں
حاضر نہیں، کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی میں بیدار یا خوابیدہ موجود
نہیں۔'' (۱)

کچھ اسی قسم کی تنقید سجاد انصاری نے بھی مولانا آزاد کی نثر اور اقبال کی شاعری کے بارے میں لکھی ہے۔ ان کا بیان ہے ''اگر قرآن شریف اردو میں نازل ہوتا تو مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر ہوتی یا اقبال کی شاعری۔''

احتشام حسین محض تاثراتی تنقید کو ہی تنقید کی معراج نہیں مانتے ہیں وہ کہتے ہیں:۔

''تنقید کسی تاثر کے متعلق محض تاثر ہے۔ اس کی افادیت کیا ہے۔
تخلیقی تنقید کا یہ نظریہ ایک بے حقیقت، کمزور اور ناکارہ فلسفے پر مبنی
ہے۔'' (۲)

احتشام حسین ایک دوسری جگہ پر یوں رقمطراز ہیں:۔

''تنقید نگار سے اس کی امید کی جاتی ہے کہ وہ صرف اپنے ذوق اور
وجدان کی مدد سے نہیں مختلف علوم کی مدد سے ادبی حسن کی ان
گتھیوں کو حل کرے گا۔'' (۳)

---

(۱) ''محاسن کلام غالب''، عبدالرحمٰن بجنوری، ص ۱۰۲

(۲) ''تنقید: نظریہ اور عمل''، مشمولہ: ''تنقیدی نظریات''، ص ۱۲۷

(۳) ''عکس اور آئینے''، احتشام حسین، ص ۲۵۱

دور جدید میں ادب میں سماجی نقطہ نظر کا اثر بہت واضح ہو گیا ہے۔ نقاد کسی بھی فن پارے کے مطالعے کے وقت اس بات پر نظر ضرور رکھتا ہے کہ فن پارے میں فنکار نے کس زاویے سے سماجی مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور اس کا انداز فکر کیا ہے۔ اس کے فن میں طبقاتی کشمکش اور سماجی زندگی کی کیسی تصویر نظر آتی ہے۔ عام انسانوں کی طرح ادب پر بھی حالات اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی تخلیق میں ان حالات کی جھلکیاں در آتی ہیں۔

جدید تنقید میں باضابطہ ایک اسکول مارکسی نقادوں کا ہے۔ اس دبستان تنقید کا بانی مارکس ہے۔ مارکس نے ادب اور تنقید کے تعلق سے بہت زیادہ نہیں لکھا ہے۔ لیکن اس نے سیاسی معاشیات میں ادب اور سماج کے بارے میں اپنا نقطہ نظر واضح طور پر بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ ادب بھی سماجی شعور کا ایک واضح حصہ ہے اس کا خیال ہے کہ جس سماجی یا طبقاتی کشمکش کا ادیب یا فن کار شکار ہو گا اس کی تخلیقات میں اس کی جھلک بہر حال نظر آئے گی۔

مارکس کے دوش بدوش لینن کا نام آتا ہے۔ لینن نے کلاسیکی ادب کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور ادبی تنقید کے کچھ اصول وضع کئے ہیں۔ لینن ادب پر بحث کرتے ہوئے اس بات پر ضرور نظر رکھتا ہے کہ مصنف نے اپنے زمانے کے خیالات و نظریات، تحریکات اور معاشرے کی عکاسی کرنے میں کس قدر گہرائی و گیرائی اور دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔ مارکسی ناقدین کہتے ہیں کہ ادب کی تنقید خالص ادب کے دائرے میں رہ کر نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ دوسرے علوم کا بھی سہارا لیا جائے۔ ادب کا مطالعہ کرنے اور اس کی تنقید کے لئے خالص فنی خوبیوں سے قطع نظر بعض دوسرے علوم سے بھی استفادہ کرنا ہو گا۔ سماجی یا مارکسی تنقید کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ادب کے زندگی سے تعلق اور اس کی افادیت پر زور دیا۔ اس طرح تنقید اور ادب کا یہ نظریہ مارکس اور لینن سے ہوتا ہوا مغربی نقادوں کرسٹوفر، کاڈویل، لوکاچ وغیرہ تک آیا اور غیر معمولی شہرت کا سبب بن گیا۔

یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ عظیم شخصیتیں کسی خاص عہد کی مخلوق ہی نہیں خالق بھی ہوتی ہیں۔ ان کا شعور اتنا توانا، فکر اس قدر وسیع و ہمہ گیر ہوتی ہے جن سے دنیا میں ہلچل اور انقلاب آجاتا ہے۔ یہ اپنے نظریات سے سماج اور معاشرے کو متاثر کرتی ہیں۔ جب یہ سماج اور معاشرہ روبہ زوال ہوتا ہے، اخلاقی اور سماجی قدریں پامال ہوتی نظر آتی ہیں، ملک کی معاشی و اقتصادی صورت حال ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے اور عوام کا آرام وسکون ختم ہونے لگتا ہے تو یہیں سے طبقاتی کشمکش جاری ہوتی ہے اور کارل مارکس پیدا ہوتا ہے۔ مارکس غیر معمولی ذہنیت کا حامل انسان تھا اس نے یورپ کے نظام حیات سے متاثر ہو کر انسانیت کو ایک نظریہ دیا جسے جدلیاتی مادیت کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ اس نظریے کا مقصد یہ ہے کہ مادہ متحرک اور تغیر پذیر ہے اس کا تعلق ہمارے خیالات، معتقدات اور فکر واحساس سے گہرا ہے۔ جس طرح حالات زمانہ میں تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے اسی طرح زندگی میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ چونکہ ادب زندگی کا ترجمان ہے اس لئے حالات کے ساتھ اس میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ مارکس کے نظریات نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنا عمل دخل جاری رکھا ہے۔ اہل یورپ پر بھی اس کے اثرات واضح طور پر پڑے اور اس اثر نے ہندوستان کے ان نوجوانوں کو بھی متاثر کیا جو اس وقت یورپ میں زیر تعلیم تھے۔ ان طالب علموں میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور دین محمد تاثیر اہم ہیں۔ ان نوجوانوں نے ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنائی اور اس کا ایک منشور بھی مرتب کیا۔ اس منشور کا بنیادی مقصد نئے عصری تقاضوں سے ہم آہنگی پیدا کرنا، نیا شعور حیات بخشنا تھا تاکہ زندگی مایوسی، کشمکش اور استحصال سے نجات حاصل کر سکے۔ اس سلسلے میں ۱۹۳۵ء میں ایک کانفرنس طلب کی گئی جس میں میکسم گورکی، ٹامس مان، اندرے مارلو، ملک راج آنند اور سجاد ظہیر جیسے ادبا شریک ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب دنیا کے سارے ادیب جمع ہو کر ترقی پسند نظریئے کی تائید کر رہے تھے۔ اس کانفرنس میں اندرے مارلو نے ایک ایسا زبردست خطبہ پیش کیا کہ جس میں پوری دنیا کے استحصال زدہ عوام غریبوں اور

مفلسوں کو ایک پلیٹ فارم پر لے آنے کی تلقین کی گئی تھی۔ اس کانفرنس میں بتایا گیا تھا کہ ہمیں زندگی کے ذاتی نہاں خانوں سے نکل کر اجتماعی مفاد اور زندگی کی اعلیٰ تہذیب وثقافت کی ترجمانی نیز حفاظت کے لئے آگے آنا چاہئے۔

ہندوستان میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ اس کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے منشی پریم چند نے جو خطبہ دیا وہ ترقی پسند نظریے کی تبلیغ واشاعت میں کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ اپنے خطبے میں پریم چند نے کہا:۔

"ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ رہا ہے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں ہنگامہ، حرکت اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں۔"

اس تحریک میں جن نوجوانوں نے عملی طور پر حصہ لیا اور عملی تعاون پیش کیا ان میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، اختر حسین رائے پوری، مجاز لکھنوی، علی سردار جعفری، رشید جہاں، محمود الظفر، فیض احمد فیض، مجنوں گورکھپوری، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، خلیل الرحمن اعظمی، راجندر سنگھ بیدی، جاں نثار اختر، اختر سندیلوی، پرویز شاہدی، سہیل عظیم آبادی، احتشام حسین وغیرہ شامل تھے۔

اس زمانے میں اردو تنقید نے بھی ارتقاء کے ہفت خواں طے کیے۔ اردو تنقید کے جس پودے کو حالی نے لگایا تھا اس کی صحیح طور پر آبیاری اور دیکھ ریکھ اسی عہد میں ہوئی۔ فرق صرف اتنا رہا کہ حالی نے اخلاقی پہلوؤں کو اجاگر کیا تھا اور ترقی پسند تحریک کے ہم نواؤں نے سماجی معنویت پر زور دیا اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ جب پرانا نظام بدل جاتا ہے تو خود کو نئے نظام کے حوالے کر دیتا ہے۔ ادب ہو یا فلسفہ ہو زمانہ اور ماحول کا پیدا کردہ ہوتا ہے اور زندگی کے تمام اسباب اور حالات سے متاثر ہوتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر سے جدید تعلیم کی آمد کے ساتھ ہی ساتھ ادب پر بھی مغربی اثرات پڑنے لگے، مغربی درآمدات کے ساتھ ہی ساتھ انگریزی کی ادبی کتابیں اوران کے تراجم بھی ہمارے ادب کو متاثر کرنے لگے۔ ارسطو، افلاطون، سنت میو اور تین کے نظریات نے ہندوستان کی ادبی فضا کو اپنے طور پر متاثر کیا۔ اس زمانے میں تین کا نظریہ بہت زیادہ مقبول ہوا۔ تین نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ادب بھی اپنے ماحول کا پیداوار ہوتا ہے۔ تین (Tain) کے اس نظریئے نے آگے چل کر یونگ کے یہاں آرکی ٹائپ Archetype اور اجتماعی لاشعور کے نظریے کو جنم دیا۔ انیسویں صدی کے درمیانی حصے میں Tain کے تاریخی نظریے کے ساتھ سماجی نظریے کی ابتدا مارکس اور اینگل نے کی اور پھر اس نظریے کو دوسرے نقادوں نے بھی اپنایا۔ مارکس نے اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:-

"اپنے وجود کے ذرائع کو سماجی پیداوار میں انسان متعین کرکے ایسے ضروری رابطوں میں داخل ہوا جو اس کے شعور سے آزاد تھے۔ یہ اصل میں پیداوار کے رشتے تھے جو ایک متعینہ مدت تک ان کی مادی پیداوار کی ارتقاء میں ممد ثابت ہوتا ہے۔ ان پیداوار کے رشتوں کا مجموعہ سماج کا ایک اقتصادی ڈھانچہ بناتا ہے۔ جس کی بنیاد پر ایک سیاسی اور قانونی ڈھانچہ ابھرتا ہے اور جس سے متعین قسم کے سماجی شعور متعلق ہوتے ہیں۔ پیداوار کا طریقہ مادی وجود کے ذرائع کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس سے سماجی، سیاسی اور ذہنی زندگی مشروط ہوتی ہے۔ انسان کے شعور سے اس کا وجود نہیں متعین ہوتا بلکہ اس کے برخلاف یہ سماجی وجود ہوتا ہے جو ان کے تصور کو متعین کرتا ہے۔" (۱)

---

(1)"Literature and Arts", K.Marx & Angles,p10

مارکس کے اس نظریے پر کافی بحثیں ہوئیں۔ یہ بحثیں زیادہ تر اخلاقی تھیں۔ مخالفین نے مارکس کی تنقید کو میکانکی یا جبریت سے تعبیر کیا۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ مارکس نے خالص سماجیات یا اقتصادیات پر کہیں بھی زور نہیں دیا ہے بلکہ فنی حسن، جمالیات اور فنی اقدار کو شامل رکھا ہے۔ مارکس اس کے بغیر ادب یا ادبی تنقید کو مکمل نہیں مانتا۔ اس کا نظریہ تنقید سماجی، مادی، تاریخی اور جدلیاتی حقیقتوں کے ساتھ ایک اچھے فن پارے میں احساسات کی رفعت، نفس وروح کی پاکیز گی، جمالیات و تاثرات اور فنی اقدار کے شعور کو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ جب ہم ان تمام چیزوں اور پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر ادبی تخلیق کی جانچ کرتے ہیں تو اسے ہم یقینی طور پر سائنٹفک تنقید کہہ سکتے ہیں۔ یہاں ذرا سائنٹفک تنقید کے سلسلے کی ایک غلط فہمی دور کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بعض حضرات سائنٹفک تنقید سے یہ مراد لیتے ہیں کہ اس میں تنقید بالکل فارمولا کے طور پر استعمال ہو جب کہ سائنٹفک نظریہ تنقید ادب کی تخلیق کو مخصوص تاریخی اور مادی حالات کی پیداوار سمجھتا ہے۔ وہ مظاہر کے تجزیے میں اندرونی کشمکش، ارتقاء اور حرکت پر نظر رکھتا ہے۔ یہ نظریہ تنقید مواد اور ہیئت کی تقسیم اور امتیاز کو تسلیم نہیں کرتا ہے۔ بلکہ مواد کو ہیئت پر ترجیح دیتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ سائنٹفک نظریے کو درست تسلیم کرنے والا نقاد زندہ سماجی حقیقتوں اور تصوراتی تخلیقات کے درمیان رشتہ قائم کرتا ہے۔

ابھی تک میں نے محمد حسین آزاد اور حالی کی تنقیدی کاوشوں سے بحث کی ہے اور ان کے دوش بدوش آنے والے چند ایک ناقد کا تذکرہ کیا ہے، سچ یہ ہے کہ حالی سے ہی ادبی تنقید کے نظریات کی بحث چلتی ہے۔ ''مقدمہ شعر وشاعری'' میں حالی نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

> ''قاعدہ ہے کہ جس قدر سوسائٹی کے خیالات، اس کی رائیں، اس کی عادتیں، اس کی رغبتیں، اس کا میلان اور مذاق بدلتا ہے اسی قدر شعر کی حالت بدلتی رہتی ہے اور یہ تبدیلی بالکل بے مصرف معلوم ہوتی ہے کیونکہ سوسائٹی کی حالت کو دیکھ کر شاعر قصداً اپنا رنگ نہیں

بدلتا بلکہ سوسائٹی کے ساتھ وہ خود بخود بدلتا جاتا ہے۔"(۱)

اس اقتباس سے حالیؔ کے تنقیدی نظریات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حالیؔ اردو کے پہلے اور بڑے نقاد ہیں، ان سے قبل جو تنقیدی سرمایہ دستیاب ہے اس میں تنقید کا باضابطہ شعور نہیں ملتا، اور نہ اس میں تنقید کی باقاعدہ کوئی روایت ملتی ہے۔ خود حالیؔ کے یہاں "مقدمہ شعرو شاعری" سے قبل کچھ متفرق اشعار اور منتشر خیالات ملتے ہیں۔ "مجموعہ نظم حالیؔ" کے دیباچے میں اس شعور کی ابتدائی صورت نظر آتی ہے۔ یہ نقوش زیادہ گہرے اور واضح نہیں ہیں لیکن پھر بھی ایک نئے تنقیدی شعور اور تنقیدی روایت کی ابتدا کے مظہر ضرور ہیں "مقدمہ شعرو شاعری" ہی میں پہلی بار شاعری کی ماہیت اور اصولِ شعر سے بحث کی گئی ہے اور متعدد سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ بقول کلیم الدین احمد:-

> "اردو تنقید (پرانی تنقید) کی ابتدا حالیؔ سے ہوتی ہے۔ پرانی تنقید محذوف و مقصود کے جھگڑوں، زبان و محاورات کی صحت، اساتذہ کی ہنگامہ آرائی تک محدود تھی، حالیؔ نے سب سے پہلے جذبات سے قطع نظر کی اور بنیادی اصول پر غور و فکر کیا۔ اپنے زمانہ، اپنے ماحول، اپنے حدود میں حالیؔ نے جو کچھ کیا وہ بہت تعریف کی بات ہے۔ وہ اردو تنقید کے بانی بھی ہیں اور اردو کے بہترین نقاد بھی۔"(۲)

اردو تنقید پر مغرب کے اثرات حالیؔ کی تصنیفات سے ہی ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن باقاعدہ طور پر سماجی اور اقتصادی رجحانات کی جھلک ۱۹۳۶ء کے بعد ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ترقی پسند تحریک نے اردو تنقید کو خاطر خواہ متاثر کیا اور اس تحریک کے زیر اثر اردو تنقید نے

---

(۱) "مقدمہ شعرو شاعری"، الطاف حسین حالی، ص ۱۰

(۲) "اردو تنقید پر ایک نظر"، کلیم الدین احمد، ص ۴۸۷

ارتقاء کے ہفت خواں طے کیے۔ اردو تنقید کو سمت و رفتار عطا کرنے والے ناقدین میں اختر حسین رائے پوری کا نام اہمیت رکھتا ہے۔ انجمن ترقی اردو کے ترجمان رسالے ''اردو'' میں ۱۹۳۵ء میں ان کا ایک اہم مضمون ''ادب اور زندگی'' شائع ہوا، جس نے اردو تنقید کی روایت کو آگے بڑھانے میں کافی مدد پہنچائی۔ انہوں نے اپنی تنقید میں ادبی اصولوں کی بجائے سماجی ضرورتوں پر زیادہ زور دیا۔ اختر حسین اردو اور فارسی زبانوں کے علاوہ سنسکرت زبان بھی جانتے تھے اور انہوں نے روسی مفکرین کے خیالات و نظریات سے بھی استفادہ کیا تھا۔ ہندی اور بنگالی زبانوں سے واقفیت کی بنا پر ان کی تنقید میں روح عصر اور ایک قسم کا رکھ رکھاؤ ملتا ہے۔ اختر حسین نے پرانے عقیدوں سے چشم پوشی کی اور زندگی کو نئے تناظر میں دیکھا اور وقت کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی ساتھ لے کر چلنے کی تلقین کی۔

اختر حسین رائے پوری کے علاوہ اردو تنقید میں ایک اور بڑا نام سجاد ظہیر کا ہے۔ یہ اردو دنیا میں کئی حیثیتوں سے مشہور ہیں ''پگھلا نیلم'' کے خالق کی حیثیت سے ''لندن کی ایک رات'' کے مصنف کی حیثیت سے اور ترقی پسند تحریک کی بوطیقا یعنی ''روشنائی'' کے خالق کی حیثیت سے۔ سجاد ظہیر اردو میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں اور روح رواں میں تسلیم کیے جاتے ہیں۔ کسی کو بھی ترقی پسند تحریک سے نظریاتی اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس تحریک کے زیر اثر اردو تنقید میں کافی وسعتیں آئیں اور اردو تنقید کی روایت ارتقا پذیر ہوئی۔

سجاد ظہیر نے تنقیدی نظریات پر کوئی باقاعدہ کتاب تصنیف نہیں کی بلکہ ان کی بعض علمی کتابوں میں تنقیدی گوشے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ''روشنائی'' اور ''ذکر حافظ'' کے علاوہ وقتاً فوقتاً ''نیا ادب'' ''عوامی دور'' اور دوسرے رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے ان کے مضامین ان کی تنقیدی بصیرت اور ان کے تنقیدی نظریات کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ مارکسی تنقید اور ادب کے سماجی نظریے کے بارے میں پیدا شدہ

ان غلط فہمیوں کو دور کیا جو عام طور پر انتہا پسندانہ رویہ کی وجہ سے پیدا ہو گئیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو تنقید کی تاریخ سجاؔد ظہیر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔ ان کی کتاب ''ذکر حافظ'' میں ان کا تنقیدی مسلک کھل کر سامنے آیا ہے۔ قدیم ادب کے بارے میں ان کا رویہ نہایت منصفانہ تھا۔ وہ ہی ماضی کے ادب کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس سلسلے میں بھی ان کا رویہ انتہا پسندانہ نہیں تھا۔ سجاؔد ظہیر نے اپنے نظریاتی مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا اور ادبی مطالعہ یا فنی اقتدار کے تعین کے لئے جو اصول و نظریات پیش کئے تھے۔ انہیں عملی تنقید میں دیانت داری کے ساتھ برتا بھی ہے۔ سجاؔد ظہیر کی تنقید نگاری سے متعلق سید احتشام حسین نے ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:-

> ''سجاد ظہیر تخلیق و تنقید دونوں میں مارکسی نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔''(۱)

شارؔب ردولوی نے بھی سجاؔد ظہیر کی تنقید نگاری سے متعلق بڑی متوازن رائے دی ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

> ''سجاد ظہیر کو اپنی تنقیدوں سے دو کام انجام دینے پڑے جو شاید کسی دوسرے نقاد نے نہیں کئے ہوں گے۔ اول یہ کہ انہوں نے صحت مند انداز فکر، سنجیدہ اور متوازن انداز فکر، مدلل اور غیر جانب دار تنقیدی نقطہ نظر پیش کیا ہے جس کی بنیاد انسانیت پرستی، دنیا کو زیادہ حسین اور دلکش زندگی کو زیادہ با معنی اور پر کشش بنانے پر تھی۔ دوسرے یہ کہ ترقی پسند اور مارکسی ادیبوں اور ناقدوں کے غلط رویوں اور تنگ نظری کی اصلاح کی اور انہیں ترقی پسندی کے جوش میں تنگ نظری

---

(۱) ''عکس اور آئینے''، احتشام حسین، ص ۳۳

اور تعصب سے بچنے کی تلقین کی یہ کام بہت سخت اور مشکل تھا لیکن اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعہ انہوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ یہ کام انجام دیا۔ ان کی یہی انصاف پسندی اور توازن، ان کے خیال کی وسعت اور ہمہ گیری، جمالیاتی احساس اور شعور فن، لطافت، نرمی اور شدید احساس حسن سنجیدگی، مدلل انداز اور وسیع النظری نے انہیں اردو کا ایک اہم مارکسی نقاد بنا دیا۔'' (۱)

اردو تنقید نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں مجنوں گورکھپوری نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ شروع میں یہ تاثراتی تنقید کے علمبرداروں میں شمار کیے جاتے تھے لیکن اس زمانے میں بھی ان کی تنقید محض تاثرات تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ عقل و شعور سے کام لے کر ان تاثرات کی اصلیت و حقیقت اور ان کے محرکات تک پہنچنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق تنقید بھی ادب کی ایک صنف ہے اور لکھنے والے کے ذاتی ذوق اور اس کے اپنے جذبات سے کبھی الگ نہیں کی جا سکتی۔

مجنوں گورکھپوری تنقید میں ذوق اور وجدان کے سخت حمایتی تھے ان کے نزدیک شاعری کا تجزیہ اور اس کی تحلیل صرف ذاتی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر کی جا سکتی ہے۔ شارب ردولوی نے مجنوں گورکھپوری کی تنقید نگاری سے متعلق لکھا ہے:-

''مجنوں کے تنقیدی نظریات ہمیں ان کے مختلف مضامین میں ملتے ہیں اور ان مضامین سے ان کے بارے میں جو رائے قائم کی جا سکتی ہے وہ ابتدا میں جمالیاتی اور تاثراتی اور بعد میں حقیقت پسندانہ مارکسی اور سائنٹفک ہے۔ وہ عملی تنقید میں بھی مارکسی نقطہ نظر

---

(۱) ''جدید اردو تنقید: اصول و نظریات''، شارب ردولوی، ص ۳۵۷

کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن یہ پیروی انتہا پسندانہ نہیں ہے جو فن کے حسن کو مجروح کرتی ہے۔ بلکہ ان کے یہاں مارکسی جدلیاتی نقطہ نظر کے ساتھ جمالیاتی اور فن کے دوسرے محاسن کا احساس بھی ملتا ہے۔ انہوں نے جہاں فراقؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے زندگی کی جدلیت کے تیز شعور کا احساس کیا ہے وہیں ان کے منفرد آہنگ، نرمی اور گھلاوٹ کی اہمیت کا بھی اظہار کیا ہے۔ اس طرح عملی نقید کے بہت سے مضامین میں انہوں نے کسی شاعر یا اس کی تخلیقات کی قدروں کا تعین کرتے ہوئے تاریخی مادیت، جدلیت، جمالیاتی حسن اور انداز و آہنگ کو بھی سامنے رکھا ہے۔ وہ کلاسیکی ادب اور روایات کا اتنا ہی احترام کرتے ہیں جتنا ادب کی نئی تعبیرات کا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف تاثراتی ہونے کے باوجود دوسری طرف مارکسی اور سائنٹفک نقاد ہیں۔ ادب ان کے لئے حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہے۔ جس میں وہ واقعیت، تخیلیت، افادیت اور جمالیت کو ایک آہنگ اور اجتماعیت اور انفرادیت کو ایک مزاج دیکھنا چاہتے ہیں۔" (۱)

اردو تنقید کی روایت کو استحکام بخشنے والوں میں ڈاکٹر عبدالعلیم کا نام بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ انہوں نے اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ جدید ادب و تنقید کی آبیاری کی ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اردو ادب میں تنقید سے متعلق انہوں نے کوئی مستقل کتاب تو نہیں چھوڑی ہے البتہ اپنے بیش قیمت مضامین و مقالات

---

(۱) "جدید اردو تنقید: اصول و نظریات"، شارب ردولوی، ۱۹۹۰ء، ص ۳۶۵

سے اردو تنقید کے سرمائے میں اضافہ ضرور کیا ہے۔ ان کا محض ۹۰ صفحات کا ایک کتابچہ ''اردو ادب کے رجحانات پر ایک نظر'' ایک وقیع کتابچہ ہے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم کے مضامین کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں اور ادیب کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ زمانے کی ترجمانی کرے۔ ان کے مضمون ''ادبی تنقید کے بنیادی اصول'' نے ایک زمانے میں کافی شہرت حاصل کی۔ اس مضمون میں وہ ادبی تنقید کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:۔

> ''ادبی تنقید کا مقصد یہ ہے کہ ادب کو پڑھنے والوں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔ جو ادیب سنجیدہ پڑھنے والوں کو اپنا مخاطب بنانا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی کی کشمکش کی تصویر کھینچے اور جہاں تک ممکن ہو پڑھنے والوں کے تجربات اور مشاغل سے لگاؤ پیدا کرے تاکہ انسانی ماحول کا مکمل خاکہ سامنے آئے۔ ناقد کا فرض ہے کہ وہ ادبی کارناموں کو اس معیار سے جانچے۔ تنقید نہ صرف پڑھنے والوں کے لئے ضروری ہے بلکہ مصنف کے لئے بھی اہم ہے۔ ناقد کا یہ کام ہے کہ ادب کے میدان میں جو ترقی ہوئی اس کی کیفیت کو واضح کرے اور ادیبوں سے علم انسانی میں جو اضافہ ہوا ہے اس کو مرتب طور پر پیش کرے .... ناقد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ادبی کارناموں کی تاریخی اہمیت کو واضح کرے۔ ادیب کی دماغی صلاحیت کا معائنہ کرے، ان عناصر کو جانچے جو ادیب نے استعمال کئے ہیں۔ ادیب کے نقطہ نظر اور مقاصد سے بحث کرے۔''(۱)

---

(۱) ''ادبی تنقید کے بنیادی اصول''، ڈاکٹر عبدالعلیم

اردو تنقید کی روایت کو سمت و رفتار عطا کرنے والے ناقدین میں پروفیسر احتشام حسین کی آواز بہت توانا ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ احتشام صاحب کی تنقید نگاری کو ہی محور بنا کر لکھا گیا ہے اور موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے اگلے باب میں ان کی تنقید نگاری سے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے، مگر اس باب میں بھی احتشام حسین کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

احتشام حسین بنیادی طور پر سماجی نظریات کے علمبرداروں میں ہیں اور ادب کو اس کے گردوپیش اور ماحول کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ احتشام حسین ترقی پسندوں میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں کیونکہ وہ خصوصیت کے ساتھ مارکسی تنقید کی طرف متوجہ رہے ہیں۔ وہ اردو کے کلاسیکی ادب کی عظمت و وقعت کے قائل ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں۔ انہوں نے مختلف موقعوں پر ترقی پسند تنقید کی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ انہوں نے نقاد کے لئے جدید اور قدیم ادب سے آگہی ضروری قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تنقید کے سلسلے میں ذرا سی کم علمی یا لاعلمی نقاد کو اپنے منصب سے ہٹا سکتی ہے۔ اس بات کا سبھی کو علم ہے کہ تنقید میں احتشام حسین کو کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے لیکن اس سے ان کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا ہے۔ ان کا تنقیدی اثاثہ ان کے تقریباً ایک درجن تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں اور یہ مجموعے ان کے تنقیدی دائرے کی تکمیل کر دیتے ہیں کیونکہ ان کے مضامین میں واضح طور پر ان کے نظریے کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے ادباء اور شعراء کی کتابوں پر بلا تکلف پیش لفظ بھی لکھے، مقدمے بھی تحریر کئے ان تحریروں میں واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے وہ یہ کہ انہوں نے قلم کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا ہے، علمی سودے بازی نہیں کی ہے۔

احتشام حسین نے اردو تنقید کو جو فکر اور فلسفیانہ گہرائی دی اس سے اردو تنقید کا دامن یکسر خالی تھا۔ وہ پہلے نقاد ہیں جنہوں نے سماجی نقطہ نظر پر اردو میں سائنٹفک تنقید کی بنیاد رکھی اور سماجی نقطہ نظر کو افراط اور تفریط کے الزام سے بچایا۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ ان سے پہلے کسی دوسرے نقاد نے واضح طور پر تنقید کے اصول اور نظریات پیش نہیں کئے تھے۔ احتشام

حسین کا نظریہ تنقید اس قدر پختہ تھا کہ دوسرے ناقدین نے بھی اس راہ پر چلنے کی کوشش کی، اس کا احساس احتشام حسین کو بھی تھا۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''اردو والوں میں تنقیدی ادب کے مطالعے کا صرف شوق ہی نہیں بڑھ رہا ہے بلکہ وہ نقطہ نظر بھی عام ہو رہا ہے جسے میں نے اپنی تحریروں میں برے بھلے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔''(۱)

اردو تنقید میں ڈاکٹر محمد حسن کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ ان کی تنقید نگاری سے متعلق ڈاکٹر وہاب اشرفی کا یہ خیال بہت مناسب ہے:۔

''ڈاکٹر محمد حسن چاہتے ہیں کہ ادب کی تفہیم کے سبھی پہلوؤں اور طریق کار کو مناسب حد تک کام میں لایا جائے تاکہ تنقید محض عملی کوشش ہو کر نہ رہ جائے بلکہ وہ ادب کو اس کی تمام فکری اور جمالیاتی تہہ داریوں کے ساتھ پہچان سکے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہ یہ سوچنا کہ ادبی تنقید کا کوئی دبستان ادب شناسی کی سبھی جہتوں سے انصاف کر سکتا ہے، بے انصافی کی بات ہے۔ نئی ترقی پسندی کا یہ تناظر بہتوں کو یہ احساس دلائے گا کہ پروفیسر محمد حسن زیادہ کھلی فضا میں سانس لینا چاہتے ہیں۔''(۲)

ڈاکٹر محمد حسن نے تنقید کو ذاتی تعصبات اور ذاتی رائے زنی کی حد سے بلند کر کے ایک علمی اور فلسفیانہ سطح دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے تنقید اور تحقیق کے باہمی رشتوں کو بھی مستحکم بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

---

(۱) ''تنقیدی جائزے''، احتشام حسین، ص ۱۰

(۲) ''اردو تنقید کی نئی صورت''، مشمولہ: ''آگہی کا منظر نامہ''، ۱۹۹۲ء، ص ۳۳

اپنی ایک الگ راہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ محمد حسن اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ادب انسانی زندگی اور اس کے تہذیبی ڈھانچے پر اثر انداز ہوتا ہے اس لئے اس کا سیاسی و تہذیبی و عمرانی مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوسکتا۔ ادب کی جانچ اور تنقید کے سلسلے میں وہ مارکسی نقطہ نگاہ کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مارکسی تنقید فن اور زندگی کے باہمی رشتوں کی نگراں ہے۔ وہ ایک طرف ادب و زندگی کے ربط باہمی کو نظر میں رکھتی ہے۔ ادب زندگی پر اثر انداز ہونے کی کوشش میں زندگی سے اثر لیتا ہے۔ زندگی کو تبدیل کرنے کی کوشش میں بہتر طور پر شریک ہونے کے لئے خود کو تبدیل کرتا ہے۔ دوسری طرف مارکسی تنقید ادب کے دائرے کے اندر رہ کر اسے ایک نئے تضاد سے آشنا کرتی ہے۔ اور یہ تضاد ادب کو بہتر، تازہ تر اور شاداب تر بناتا ہے۔

اختر انصاری کا نام بھی اردو تنقید کے میدان میں نا قابل فراموش ہے۔ یہ اردو ادب اور تنقید کے خاموش خدمت گزاروں میں ہیں ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''مطالعہ اور تنقید'' کے مطالعے سے ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کے مضامین مثلاً اردو غزل، ادب اور سیاست جنگ، سیاست اور شاعری کے علاوہ اقبال کی شاعری کا نیا آہنگ، مجاز کی شاعری وغیرہ سے ان کے تنقیدی موقف کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان مضامین میں جو توازن و اعتدال پایا جاتا ہے وہ اس دور میں جب یہ مضامین لکھے گئے عام نہیں تھا۔ ان کی نظر تنقید کی عالمی روایت پر جتنی گہری ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی معلومات اور ادبی بصیرت کو بروئے کار لا کر ناول، افسانہ اور غزل کی تنقید میں زیادہ ٹھوس اور وقیع کام کر سکتے تھے۔ بقول ڈاکٹر ابن فرید:-

> ''خاموش مگر سنجیدہ شاعر، افسانہ نگار اور تنقید نگار اختر انصاری تشہیر اور پروپیگنڈہ سے اس قدر دور رہتے ہیں کہ انہیں اپنی تحریروں کے جائز تعارف کا خیال بھی نہ آیا۔ مطالعہ اور تنقید کا بھی یہی حشر ہوا۔ اختر انصاری کے تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ اس قدر اہم مجموعہ ہے

کہ ہر معیاری اور موقر جریدے میں اس پر تبصرہ ہونا چاہئے تھا۔
تنقید میں اختر انصاری کا ایک خاص اسلوب جو انتہائی سنجیدہ، مدلل
اور وقیع ہے۔ ان کے یہاں وسیع مطالعہ اور مطالعہ سے خاطر خواہ
فائدہ اٹھانے کا ثبوت ملتا ہے۔ ادب ان کے لئے تفنن طبع نہیں
ہے چنانچہ تنقید کو وہ کافی اہمیت دیتے ہیں۔" (۱)

اختر انصاری نے بھی مجنوں گورکھپوری کی طرح اپنی تنقیدی نگارشات میں ادب اور زندگی کے درمیان پائے جانے والے فطری اور اٹوٹ رشتوں کی نشاندہی کر کے ادب کی جس افادیت پر زور دیا تھا وہ بڑی حد تک ماہیت سے مطابقت رکھتی تھی اس تنقیدی شعور کی رہنمائی میں اختر انصاری نے نہایت اہم رول سرانجام دیا ہے۔ انہوں نے اپنی بعض تنقیدی کتابوں مثلاً "افادی ادب"، "غزل اور اس کی تدریس" اور "حالی اور نیا تنقیدی شعور" میں اپنے تنقیدی موقف کی بڑے صاف انداز میں وضاحت کی ہے۔

ممتاز حسین کا انداز نظر اور رویہ سائنٹفک ہے لیکن وہ انتہا پسندی کے خلاف ہیں۔ انہوں نے کلاسیکی ادب کا نئے انداز سے مطالعہ کیا ہے اور اپنی تنقید میں برتا ہے۔ انہوں نے صاف طور پر قدیم اردو شاعری میں تصوف کی فکری اہمیت اور اس کے معاشرتی محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ادب میں جو تصورات اور اقدار ابھرتے ہیں وہ دراصل مختلف طبقات کے باہمی ٹکراؤ اور تصادم سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ادبی مطالعے میں طبقاتی شعور اور اس کے اثرات کو اہمیت دیتے ہیں لیکن فن کی ادبی اور جمالیاتی قدروں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ادبی تنقید ادب کی تنقید ہے اور ادب بذاخود زندگی کی تنقید ہے اس لئے ادبی تنقید بالآخر زندگی کی تنقید بن جاتی ہے۔

---

(۱) "اختر انصاری: چند یادیں"، مطبوعہ دوماہی "الفاظ" علی گڑھ، اگست ۱۹۸۳ء

عزیز احمد کا نام بھی اردو تنقید میں کافی اہم ہے۔ ان کو شہرت ایک ناول نگار کی حیثیت سے زیادہ ملی۔ اس کے علاوہ ان کی کتاب "ترقی پسند ادب" اور "اقبال: ایک نئی تشکیل" نے انہیں ناقدین کی صف میں نمایاں مقام دلوایا ہے۔ فیض احمد فیض کے بعض مضامین فیض کو بھی ناقدین میں اونچا مقام دلواتے ہیں۔ ان کے مضامین کے مجموعے "میزان" نے بحیثیت ناقد انہیں شہرت و مقبولیت عطا کی ہے اس کے علاوہ اپنی بیگم ایلس فیض کے نام لکھے گئے خطوط "صلیبیں میرے دریچے میں" سے بھی ان کے تنقیدی موقف کا اظہار ہوتا ہے۔

اردو کی تنقیدی روایات کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اردو کا قدیم تنقیدی سرمایہ کسی قدر محدود ہے۔ عام طور سے شعراء کے متفرق اشعار کے سلسلے میں کچھ تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔ بندش الفاظ اور عروض و قافیہ و ردیف سے متعلق باتیں ملتی ہیں اور کہیں کہیں نفس شعر سے متعلق بھی اشارے مل جاتے ہیں۔ شروع میں کچھ منظوم تنقیدات کی روایت بھی ملتی ہے۔ اردو شعرا کے تذکروں میں بھی تنقید کے نقوش ملتے ہیں۔ ان میں زبان و بیان سے متعلق نکات مل جاتے ہیں۔ پھر دھیرے دھیرے تنقید کی یہ روایت زور پکڑتی جاتی ہے اور محمد حسین آزاد کی "آب حیات" سے اردو تنقید کو ایک نیا موڑ ملتا ہے۔

شعر و ادب کا زندگی سے کیسا رشتہ ہے اس کی صحیح وضاحت اور اس کا صحیح احساس ہمیں سرسید اور حالی کی تحریروں اور تحریکوں سے ہوتا ہے۔ ان بزرگوں نے جو راستہ اختیار کیا اس پر چل کر جدید ذہن کی تعمیر ہوئی۔ ان دونوں کے شانہ بہ شانہ شبلی نعمانی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ حالی کی "مقدمہ شعر و شاعری" اور شبلی کی "مقالات شبلی" نے اردو تنقید کو نئے حالات اور نئی آب و ہوا سے روشناس کرایا۔ حالی نے مقصدی اور اخلاقی ادب کی ترویج و اشاعت کا کام سرانجام دیا۔ عبدالرحمن بجنوری کی "محاسن کلام غالب" نے اردو تنقید کی رفتار ارتقاء میں اہم رول انجام دیا۔ جیسے جیسے شعر و ادب کا قافلہ آگے بڑھتا گیا اور اس کی تہذیبی و سماجی اہمیت مسلم ہوتی گئی، اصول تنقید بھی سائنٹفک اور ہمہ گیر ہوتے گئے۔ مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، وقار عظیم،

احتشام حسین وغیرہ کی بدولت اردو تنقید رومانی، اشتراکی، سائنسی اور جمالیاتی نقطہ نظر اپنائی گئی اور اس طرح اردو تنقید کی روایت ارتقاء کے مدارج طے کرتی ہوئی آج اپنے نقطہ عروج پر ہے۔

***

احتشام حسین کی تنقید نگاری کا تنقیدی جائزہ

گذشتہ ابواب میں تنقید کے فن اور اردو میں تنقید نگاری کی روایت سے اپنی بساط بھر بحث کر چکی ہوں۔ اس باب میں احتشام حسین کی تنقید نگاری سے متعلق بحث مقصود ہے۔

اردو میں حالی کے بعد احتشام حسین کو تنقید اور اس کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں مختلف سوالات اٹھانے اور اپنے طور پر حل کرنے کا شرف حاصل ہے اس سے ان کے مطالعے کی وسعت، تجسس، انتخابی صلاحیت اور غیر معمولی ذہن وفکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ نظریاتی اعتبار سے دقیق ادبی وتنقیدی سوالات اٹھانا اور انہیں اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کرنا اور ان سے اصول نقد اخذ کر کے ان پر فلسفیانہ استدلال پیش کرنا ایک متین اور قابل نظریہ ساز فلسفی نقاد ہونے کی دلیل ہے۔

احتشام حسین مجموعی اعتبار سے سماجی و عمرانی نقاد ہیں اسی وجہ سے ادب اور سماج کے باہمی رشتے کو ادب کے تنقیدی مطالعے میں اولیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب کی جڑیں اسی آب وگل میں پیوست ہیں۔ فن کار بھی سماج ہی کا ایک فرد ہے اور اس کی تخلیقات سماجی بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہیں۔ ادب کے تعلقات جزوی طور پر انفرادی جذبات و احساسات سے ہوتے ہیں لیکن اس کا بڑا حصہ مشترک احساسات و مشاہدات پر مبنی ہوتا ہے کیونکہ افراد

مخصوص عہد، سماج اور معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ادیب اور ادب کی انفرادیت کے علاوہ عصری تقاضوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

ایک دیدہ ور اور حق شناس نقاد کا فرض ہے کہ وہ ادب کا مطالعہ عمیق گہرائیوں میں جا کر کرے اور اس کے مطالعے میں اخلاص کا ہونا بھی ضروری ہے ساتھ ہی غیر جانب داری بھی اس کا فرض اولین ہے، اس لئے کے تنقید کا کام کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنا ہے بہ الفاظ دیگر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی پیش کرنا ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے نقاد کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ادب اور تنقید کو ہم جدا نہیں کر سکتے۔ ادب کی جانچ پرکھ کے لئے کسی نظریے کا ہونا لازمی ہے اور اس نظریے کے ساتھ وفاداری ضروری ہے۔ پروفیسر احتشام حسین اردو کے واحد نقاد ہیں جنہوں نے تنقید کے مباحث اور مسائل پر زور دیا ہے۔ وہ شعر و ادب اور تنقید کے آداب و ضوابط مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سخن سنجی کے اصول وضع کرتے ہیں۔ سخن فہمی کی فضا نہیں پیدا کرتے۔ وہ ادب کیا رہا ہے اس سے زیادہ ادب کو کیا ہونا چاہئے کا جواب دیتے ہیں وہ ایک نئی کائنات کی بشارت دیتے ہیں مادر اس کی تعمیر و تزئین کے لئے کوشش کرت ہیں۔

انجمن ترقی پسند مصنفین نے معیار حسن کی تبدیلی کا جو نظریہ پیش کیا تھا احتشام حسین کی تنقیدیں اس کی تفسیر اور ترجمانی کرتی ہیں۔ شروع میں یہ نظریہ نعرہ بھی تھا اور پیغام بھی۔ احتشام صاحب نے اسے پیغام کی حیثیت سے قبول کیا اور ایک پیغام کی حیثیت سے پیش بھی کیا۔ ان کے یہاں یہ تصور ایک عقیدے کی شکل میں نہیں بلکہ ایک لائحہ عمل کی صورت میں پایا جاتا ہے جو عقل کی روشنی میں متعین ہوا ہے۔ انہیں اس تصور کے رد و قبول میں تشکیک کی منزلوں سے گذرنا پڑا ہے۔ ایک مبلغ کے یہاں جو جذباتی اتار چڑھاؤ، تخفیف و تحدید کی طرف جو میلان اور اپنے موقف کی قطعیت کا جو انانیتی اور پر شکوہ اظہار ملتا ہے احتشام حسین صاحب کی تحریریں ان سے یکسر خالی ہیں۔ وہ ہر موڑ پر دوسروں کی باتیں سننا چاہتے ہیں۔ اور ان کے حسن و قبح کو پرکھنے کے بعد ہی آگے بڑھتے ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین اردو کے ان دیدہ ور ناقدین میں

صف اول میں بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں جنہیں بہ حیثیت نقاد اپنی ذمہ داریوں کا شدت سے احساس تھا اس سلسلے میں ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے:۔

''بیرونی حیثیت سے ادب زندگی کے کسی نقطہ نظر کا (جو ادیب کا نقطہ نظر ہوتا ہے) پابند بن جاتا ہے اور اندرونی حیثیت سے ان قوانین فن کا جو مخصوص قسم کے ادبی اظہار کے لئے وجود میں آتے ہیں اس لئے اچھا ادیب وہ ہوگا جو اپنے نظریے اور فن دونوں سے وفاداری برتے۔ جو لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں وہ ادب کی حقیقت سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔'' (۱)

۱۸۵۷ء کے بعد مغربی ادب و تنقید کے واضح اثرات اردو ادب و تنقید پر دکھائی دینے لگے ہیں یہی وہ موڑ ہے جہاں سے اردو تنقید کو ایک نیا مزاج، نیا ذہن اور منفرد کردار ملتا ہے کیوں کہ یہی وہ زمانہ ہے جب انگریز ہندوستان پر باضابطہ طور پر قابض ہو چکے تھے اور ادب کے فروغ و ارتقاء میں بھی باقاعدہ ہاتھ بٹاتے رہے تھے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:۔

''ادب و تنقید پر انگریزی اثرات کی ابتدا کے لئے ۱۸۵۷ء کو بہ آسانی نقطہ آغاز قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اسی سال مغلیہ سلطنت باضابطہ طور پر ختم ہوئی اور ہندوستان تاج برطانیہ کے زیر نشیں برطانوی مقبوضات میں شامل ہوا۔ سر سید احمد خاں ان کی تحریک اور تحریک سے وابستہ بعض اصحاب جیسے حالؔی، شبلؔی اور آزادؔ وغیرہ نے شعوری طور پر انگریزی اثرات قبول کرتے ہوئے انہیں اپنی فکر کی اساس قرار دینے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ان کا پرچار بھی کیا۔

---

(۱) ''علی گڑھ میگزین''، نظریاتی ادب نمبر، ۱۹۵۸ء، ص ۳۲

سر سید کی شخصیت اور تحریک نزاعی ہیں۔ آج بھی اور صدی پیشتر بھی
ہمیں اس موقع پر اس تحریک کے اغراض و مقاصد اور ان سے جنم
لینے والی نزاعات سے غرض نہیں کہ یہ ہمارے موضوع کی حدود
سے خارج ہیں لیکن اس امر پر ضرور زور دیا جا سکتا ہے کہ سر سید کے
زیر اثر اردو ادب میں نئی اصناف کی جو کونپلیں پھوٹیں ان کی آبیاری
انگریزی خیالات سے کی گئی تھی جہاں تک تنقید کا تعلق ہے تو اس
ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ[1] نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ گو
سر سید باضابطہ نقاد نہ تھے لیکن کل قومی زندگی کے نقاد تھے اس لئے
لازماً شعر و ادب کے سلسلے میں بھی انہوں نے خیالات کا اظہار کیا
ہے۔ سر سید ۱۸۵۷ء تک محققانہ، مورخانہ تصانیف میں منہمک
رہے۔ انقلاب کے بعد رفتہ رفتہ مغربی اثرات قبول کرتے گئے۔
خود سر سید نے اڈیسن اور اسٹیل کے انداز پر اردو میں مضمون نگاری
کو فروغ دیا۔'' (۲)

ڈاکٹر سلیم اختر کے اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سر سید کی تحریک نے وہ دروازہ کھول دیا جسے ہم انگریزی علوم و فنون سے استفادے کا ایک اہم راستہ کہہ سکتے ہیں اس سے جہاں دوسرے بہت سے فائدے ہوئے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ تنقید واضح طور پر تذکرے کے حدود سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔ باوجود اس کے حالی کے بعد ہمارے یہاں کوئی ایسی قد آور شخصیت نہیں ملتی ہے جس نے تنقید کو مکتبی، تشریحی یا محض تاثراتی حدود سے نکال کر اپنے عہد

---

(۱) ''اشارات تنقید'' (طبع دوم)، ص ۵۴

(۲) ''اردو تنقید پر انگریزی اثرات'' (مقالہ) مطبوعہ ''الفاظ''، جولائی اگست ۱۹۷۳ء، ص ۱۵۴

کے تقاضوں سے ہم آہنگ وہم آواز کرنے کی کوشش کی ہو۔ یہ کام ترقی پسند تحریک کے حامیوں نے انجام دیا۔ یہ تحریک ایک ایسی منظم اور اجتماعی تحریک تھی جس کا مقصد اردو ادب کو ایک مخصوص نہج دینا اور سمت و رفتار عطا کرنا تھا۔ اس تحریک کے زیر اثر تنقید ادب کے لئے ایک کارآمد صنف ثابت ہوئی۔ حالی کی ''مقدمہ شعروشاعری'' سے لے کر انجمن ترقی پسند مصنفین تک اردو میں تنقید کا اچھا خاصہ سرمایہ جمع ہو گیا پھر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سماجی وسیاسی حالات کے تحت زندگی کے مختلف شعبوں کی طرح تنقید بھی نئے موڑ سے آشنا ہوئی۔

ترقی پسند تحریک اتنی قوی تحریک تھی کہ اس کے سیلابی بہاؤ سے بہت کم ادیب ونقاد محفوظ رہ سکے۔ بعضوں نے شعوری طور پر خود کو اس کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی باوجود اس کے وہ اپنی کوشش میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو سکے۔ ابتدا ہی سے اردو تنقید کے اشتراکی تصورات اور مارکسی نظریات اتنے قوی تھے اور اس کی تشہیر بھی اس پیمانے پر ہوئی تھی کہ لاشعوری طور پر اس کے اثرات زندگی کے ہر شعبے پر پڑے۔ بعض ترقی پسند مبلغین غیر ضروری انتہا پسندی اور بے اعتدالی کے ساتھ ادب وتنقید کے اشتراکی اصول ونظریات اندھادھند پیش کرنے لگے۔

دراصل ترقی پسند تحریک سے قبل ہی اردو تنقید اس ڈگر پر چلنے سے انحراف کرنے لگی تھی جس کا آغاز حالی اور ان کے رفقائے کار نے کیا تھا۔ ۱۹۳۵ء کے آس پاس جس طرح ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے پر ترقی پسندی کے اثرات واضح طور پر رونما ہونے لگے تھے اسی طرح فن تنقید میں جانچ پرتال کے نئے معیار واقدار سے کام لیا جانے لگا تھا۔ لیکن اس عبوری دور سے پیشتر ہی اصلاحی تحریک کے ذریعہ دباؤ کے شدید ردعمل کے طور پر ایسے تنقیدی تصورات و نظریات رونما ہونے لگے تھے جن کے باعث اسی اثناء میں اردو تنقید پر انتہا پسندانہ رومانیت نہایت تیزی سے حاوی ہو گئی تھی جو ادب کے خالص جمالیاتی، وجدانی، الہامی، روحانی، تاثراتی، جذباتی اور روحانی اقدار کی پروردگار تھی۔ ماضی پرستی، روایت پروری اور عصری تقاضوں سے روگردانی جس کا نصب العین تھا۔ وہ فقط ذوق ووجدان کی تسکین اور جمالیاتی

نشاط پرستی پر اول و آخر زور دیتی تھی۔ اگر چہ اس کے متوازی خطوط پر حال کے صالح باقیات کے طور پر سماجی اور حقیقت پسندانہ زاویہ نظر کارفرما تھا جس کو ہندوستان کے نئے سماجی، معاشرتی اور اقتصادی بیداری کے جلو میں ترقی پسند تحریک کے اولین مشعل بردار ناقدوں نے آگے بڑھ کر سہارا دینے اور آبیاری کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ یہ وہ عہد تھا جب عوام کی سیاسی بیداری نے جمہوری اشتراک پر قائم مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ اب کسی ادبی تخلیق کی قدر و قیمت کو صرف تقابلی، تشریحی، جمالیاتی اور داخلی نقطہ نظر سے دیکھنے کے بجائے سماجی پس منظر میں دیکھا جانے لگا۔ اس طرح پہلی بار ادب کو معروضی انداز سے زندگی کی کسوٹی پر رکھ کر دیکھا جانے لگا، زندگی کے تقاضوں کی روشنی میں پرکھا جانے لگا۔ گرچہ ابتدا میں اس میلان کی سخت مذمت و مخالفت کی گئی۔ لیکن پریم چند کے افسانوں کے ذریعہ ترقی پسندی کے منشور کے ذریعہ سجاد ظہیر، اختر حسین رائے پوری اور احمد علی کے مقالات کے ذریعہ جن تنقیدی آراء کی تبلیغ اور اشاعت کی گئی اس نے آگے چل کر ایک علیحدہ تنقیدی مسلک یا رجحان کی صورت اختیار کر لی۔ اس رجحان نے خصوصی طور پر فن تنقید کو خاطر خواہ متاثر کیا۔

یہی وہ عہد تھا جب احتشام حسین نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا کی۔ ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کا پہلا حلقہ ۱۹۳۵ء میں لندن میں قائم ہوا اور اسی سال کے آخر میں یعنی دسمبر ۱۹۳۵ء میں الہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم کی گئی۔ اگر چہ احتشام حسین کا یہ طالب علمی کا زمانہ تھا اور وہ الہ آباد میں ایم۔اے کے طالب علم تھے اس کے باوجود وہ ترقی پسندوں کے اس گروہ اور اس کے کاموں میں شامل ہو گئے۔ درحالیکہ وہ اشتراکی نظریات و افکار سے متاثر تھے۔ جس زمانے میں کمیونسٹوں پر عرصہ حیات تنگ تھا ان کی کتابیں اور مضامین ضبط کئے جاتے تھے لیکن احتشام حسین صاحب ان ضبط شدہ کتابوں اور مضامین کا بھی مطالعہ کرتے۔ اشتراکی نظریات اور افکار کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ہی انہوں نے بالکل شعوری طور پر انہیں اپنایا اور ان نظریات کی روشنی میں شعر و ادب کا تجزیاتی مطالعہ کیا۔

ترقی پسندوں کے گروہ میں شامل ہونے کے باوجود وہ صرف ترقی پسندوں تک محدود نہیں رہے اور آخری زمانے تک اس وضع داری کو نبھاتے رہے۔

۱۹۳۶ء میں لکھنو میں ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ اس زمانے میں لکھنو کے شاعروں اور ادیبوں کی بڑی تعداد ادب برائے ادب کی قائل اور روایت پرست تھی لیکن جب ترقی پسندوں نے شعر و ادب کو زندگی کا ترجمان اور حرکت و عمل کا ذریعہ قرار دیا اور عوام نے اس رجحان کو اپنی زندگی سے قریب تر پایا تو اس کی صداقت کے قائل ہو کر جوق در جوق ترقی پسند تحریک کے حلقہ بگوش ہونے لگے۔

۱۹۳۸ء میں احتشام حسین بسلسلۂ ملازمت لکھنو آئے۔ لکھنو یونیوسٹی کے شعبہ اردو فارسی کے لکچرشپ کے امیدوار مجنوں گورکھپوری اور وقار عظیم بھی تھے۔ لیکن انٹرویو میں احتشام حسین صاحب کامیاب ہوئے اور بحیثیت لکچرار ان کا تقرر عمل میں آ گیا۔ احتشام حسین لکھنو میں نووارد تھے دو تین ماہ احباب کے ساتھ گزر کرنے کے بعد بارود خانہ گوپی ناتھ روڈ پر ایک بڑا اور آرام دہ مکان کرایہ پر لیا اور والدہ، بھائی اور ایک ملازم کے ساتھ مقیم ہو گئے۔

اس زمانے کا لکھنو نئی اور پرانی تہذیب اور قدیم و جدید ادیبوں کا مرکز تھا اور مختلف نقطہ نظر رکھنے والے شعراء و ادبا اور علماء و فنکار یہاں موجود تھے۔ ترقی پسندوں اور نئی نسل کے مشہور و معروف شاعروں ادیبوں نے لکھنو کی رونق میں اضافہ کر رکھا تھا اس علمی و ادبی ماحول میں کسی نووارد ادیب و شاعر کی پذیرائی بآسانی ممکن نہیں ہو سکتی تھی لیکن ترقی پسند نقطہ نظر رکھنے کے باوجود ہر انجمن کے لئے وہ قابل قبول سمجھے گئے اور ایک ہی برس میں وہاں کی ادبی و علمی اور سماجی و سیاسی زندگی میں گھل مل گئے۔ احتشام حسین کو مخالف و موافق دونوں قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑا لیکن ان کے مزاج کے اعتدال اور ذہن کی ہمہ گیری نے بحسن و خوبی اس ماحول کو اپنی گرفت میں لے کر جلد ہی اپنی عظمت کا سکہ سب کے دلوں پر بٹھا دیا۔

۱۹۵۵ء میں احتشام حسین کو لکھنو یونیورسٹی میں بحیثیت ریڈر ترقی ملی اور ۱۹۶۱ء میں شعبہ

اردو و فارسی کے صدر کے عہدے پر فائز ہوئے اور اسی سال الٰہ آباد یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر ان کا تقرر ہوا۔ لکھنو چھوڑ دینے سے ان کے دوستوں اور رفیقوں کے وسیع طبقے میں وہ حرارت یکا یک ماند پڑ گئی۔

احتشام حسین صاحب نے باضابطہ تنقید نگاری کی ابتدا ۱۹۴۰ء کے آس پاس شروع کی۔ ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ''تنقیدی جائزے'' ۱۹۴۵ء میں منظر عام پر آیا۔ اس سے پہلے اختر حسین رائے پوری کے مضامین کا مجموعہ ''ادب اور انقلاب'' اور مجنوں گورکھپوری کے مضامین کا مجموعہ ''ادب اور زندگی'' منظر عام پر آ چکے تھے۔ باوجود اس کے صورت حال ابھی بدلی نہیں تھی ترقی پسندی سے وابستہ ناقدین اشتراکی تصورات و نظریات کے زیر اثر سماجی و سیاسی مسائل پر غیر ضروری حد تک زور دے رہے تھے۔ آزادی کی تحریک ملک کے دانشور طبقوں اور جوانوں کو متاثر کر رہی تھی۔ داخلی اور انفرادی زندگی کی نوجوان طبقہ شدید مخالفت کر رہا تھا۔ ان کے نزدیک جذباتی، تاثراتی نیز جمالیاتی نظریات فرسودہ اور از کار رفتہ ہو چکے تھے۔ ان کی خارجیت پسندی ادب اور تنقید کو کھوکھلی نعرے بازی اور پروپیگنڈے کی شکل دینے پر آمادہ تھی۔ حتیٰ کہ بعض ناقدین شعر و ادب اسے کمیونسٹ پارٹی کے آلہ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔

یہ تھا وہ ماحول یہ تھی وہ فضا جس میں احتشام حسین جیسا دیدہ ور ناقد ابھر کر سامنے آیا۔ انہوں نے باضابطہ طور پر ترقی پسند تحریک میں شامل ہو کر اپنے عہد کے تمام تنقیدی رجحانات کو سمجھنے کی کوشش کی اور اپنے وسیع مطالعہ کے ذریعہ ادب کا ایک ایسا سائنٹفک نظریہ پیش کیا جس سے نہ صرف جمود مسلسل ٹوٹا بلکہ تنقید کا ایک نیا فلسفہ سامنے آیا۔ حالیؔ نے جن نقوش کو مرتب کر کے ایک مکمل تصویر بنائی اور ان میں رنگ بھرے وہ نقوش سرسید کے زائدہ ہیں۔ ان کے مضامین میں ایسے فقرے اور جملے ملتے ہیں جن کی تفصیل، تشریح اور ترجمانی حالیؔ کے یہاں ملتی ہے۔ حالیؔ جس تنقیدی شعور اور بصیرت کے حامل نظر آتے ہیں وہ صرف ان کی قوت اختراع کا نتیجہ نہیں۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تنقید کو ایک موضوع اور ایک مبحث کی

شکل میں پیش کیا۔ انہوں نے اسے ایک وقیع فن اور ادب کے ایک شعبے کی حیثیت سے برتا اور ایک مستقل اور منفرد علم کا درجہ دیا۔

"مقدمہ شعروشاعری" سے لے کر انجمن ترقی پسند مصنفین تک اردو نگارشات کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا۔ ان میں تخلیقات کا تجزیہ کیا گیا اور تنقید کے مباحث و مسائل بھی زیر بحث آئے۔ تنقید اور تخلیق دونوں اپنے اپنے منصب اور محور پر قائم رہے اور ایک رشتے میں منسلک ہوتے ہوئے بھی اپنے اپنے قلمرو کے حدود میں رہے۔

حالؔی کے بعد میدان نقد میں متعدد ناقدین کے مجموعی کارنامے شعور کا پتہ ضرور دیتے ہیں مگر یہ کاروان فکر روایتی اور تاثراتی نقطے پر آکر ٹھہر گیا تھا۔ اظہار خیال یا تو مشرقی انداز فکر کا عکاس تھا یا مغربی نظریات کا غماز۔ دونوں کا حسین امتزاج اس وقت ممکن تھا جب کوئی ایسا مرد مجاہد اس وادی میں قدم رکھتا جو حقیقت و فطرت کا رازدار ہو اور روایت اور بغاوت پر بھی جس کی گہری نگاہ ہو۔ احتشام حسین اردو کے واحد نقاد ہیں جنہوں نے تنقید کے مباحث و مسائل پر زور دیا ہے وہ شعرو ادب اور تنقید کے آداب و ضوابط مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سخن سنجی کے اصول وضع کرتے ہیں سخن فہمی کی فضا نہیں پیدا کرتے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے معیار حسن کی تبدیلی کا جو نظریہ پیش کیا احتشام حسین صاحب کی تنقیدیں اس کی تفسیر اور ترجمانی کرتی ہیں۔ احتشام حسین نے اسے ایک پیغام کی حیثیت سے قبول کیا اور پیغام کی حیثیت سے پیش بھی کیا۔ ان کے یہاں ایک لائحہ عمل کی صورت میں پایا جاتا ہے جو عقل کی روشنی میں متعین ہوا ہے۔

ادب میں ایک لچک اور کسی قدر تذبذب کی شان پائی جاتی ہے اس میں کبھی کبھی یوں بھی ہے اور یوں بھی کی فضا ملتی ہے۔ ایک ادیب یا شاعر کے ساتھ پاسبان عقل رہتا ہے لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں واضح اور اعلانیہ طور پر نہ سہی احتشام حسین صاحب کے یہاں ملتی ہیں۔ انہوں نے شروع سے ہی اپنے مضامین و مقالات کے ذریعہ اپنے نظریات کا اعلان کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:-

"جب ادب اتنا ہمہ گیر ہے کہ اس میں ادیب کے مجموعی علم کا اثر نمایاں ہوتا ہے تو پھر ادب کا مطالعہ کرتے وقت نقاد کو ماہر نفسیات، ماہر تعلیمات، ماہر سیاسیات، ماہر اخلاقیات کی حیثیت سے دیکھنا چاہئے یا ان چیزوں سے قطع نظر یوں سوچنا چاہئے کہ ادیب کو ان باتوں سے کیا واسطہ؟ مگر ایسی غلطیاں پائی جاتی ہوں جن کا تعلق مخصوص علوم سے ہے تو ان کا احتساب کرنا چاہئے یا اس کے برعکس عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ جب ادب ان علوم سے تعلق رکھنے والی باتیں پیش کرتا ہے تو پھر ادیب کے یہاں صحت اور غلطی کیوں نہ دیکھی جائے؟ یہ سوالات بھی کچھ کم الجھن پیدا کرنے والے نہیں۔" (۱)

احتشام حسین صاحب نے اردو تنقید کو عصر حاضر میں نئی آبرو دی ہے اور اس افتخار میں شاید ہی کوئی دوسرا نقاد ان کا شریک ہو۔ ان کی تنقید میں فن کے بنیادی مسائل جھلکتے ہیں۔ پہلی بار انہوں نے ایسے اہم اور بنیادی مسائل اٹھائے اور پوری علمی سنجیدگی سے اٹھائے۔ اہمیت اس کی نہیں ہے کہ ان میں سے ہر مسئلے پر ان کی رائے مان لی جائے، اہمیت اس کی ہے کہ پہلی بار اس قسم کے بنیادی مسائل ہماری تنقید میں ابھرے اور ان کے بارے میں غور و فکر کا عمل شروع ہوا۔ اہمیت اس کی بھی ہے کہ انہوں نے ان مسائل کو اپنی شخصیت کے جادو یا اپنے اسلوب کی رنگینی اور جملے بازی سے منوانے کی کوشش نہیں کی بلکہ دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ادب میں قطعی اور حتمی فیصلے نہیں ہوا کرتے ہیں بلکہ غور و فکر سے ادبی شعور کی نئی تہیں کھلتی ہیں۔ سچی تنقید نئی آگہی اور نئی ذہنی فضا سے متعارف کراتی ہے اور اس اعتبار سے احتشام حسین

---

(۱) "ادب اور سماج"، احتشام حسین، ۱۹۴۸ء

کی تنقیدوں نے یقیناً ایک عہد آفریں کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

احتشام حسین نے مشرقی علوم کو تو اپنے پیش نظر رکھا ہی مغربی علوم سے بھی لگاتار استفادہ کرتے رہے۔ فن نقد کے ہر ممکن اور ضروری عنصر کا مطالعہ غور و فکر کے ساتھ کرتے رہے۔ مطالعے میں ان کا گہرا انہماک ان کے ذہنی ارتقا کا باعث ہوا مگر ایسا نہیں ہے کہ صرف مطالعہ ہی ان کے لئے نسخہ کیمیا ثابت ہوا۔ پڑھنے کو تو اور بھی لوگوں نے پڑھا اور شاید بعضوں نے ان سے بھی زیادہ پڑھا ہو مگر علم کی تہہ تک پہنچنا اور معلومات کی روشنی میں ان کو صحت مندی کے ساتھ بروئے کار لانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے احتشام حسین سے متعلق لکھتے ہوئے ایک جگہ اظہار خیال کیا ہے:۔

"احتشام حسین نے فن تنقید پر حسن اتفاق سے اس زمانے میں دلچسپی لی جب ان کے سامنے تیزی سے نئے مسائل آرہے تھے اور یہ فن اردو میں ہمیشہ سے زیادہ اہمیت حاصل کرنے لگا تھا۔ خیال، ہیئت، مواد پر فنی لحاظ سے تبصرے ہونے لگے تھے، آزادؔ، شبلیؔ، حالیؔ کی کاوشوں سے فائدہ اٹھا کر اہل قلم مغرب کے طرز تخئیل و فکر سے اردو ادب پر ترقی یافتہ انداز میں تنقیدیں پیش کرنے لگے تھے۔ احتشام حسین نے اپنے وسیع مطالعے سے ادبی تحریک کو فائدہ پہنچانے کی کمایاب کوشش کی۔ انہوں نے متعدد مضامین ایسے لکھے جن سے یہ بات ذہن نشیں ہوتی رہی کہ ہیئت و مواد کی اہمیت و ضرورت کیا ہے۔ شعری و جمالیاتی اقدار کا کیا مطلب ہے، سماج اور ادب میں کیا رشتہ ہے، تنقید و عملی تنقید کا مطلب کیا ہے۔" (۱)

---

(۱) "مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۵۱۶

احتشام حسین کی تنقیدی نگارشات سے اردو تنقید کو وزن و وقار ملا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ ان کے نظریات بنیادی طور پر مارکسی اور اشتراکی تھے ان کا خیال تھا کہ نظام سب سے بہتر نظام ہے اور ادب و معاشرے کو اسی کا پرتو ہونا چاہئے۔ انہوں نے مارکس کے مادی، جدلیاتی اور سیاسی فلسفہ کو بہت ہی حسن بیانی کے ساتھ ادب میں ڈھالا ہے۔ ان کے قلم سے مارکسی فلسفہ کی ادب میں ترجمانی فلسفیانہ بلندی اور حکیمانہ انداز کی حامل ہے جس پر فن و ادب کی گہری چھاپ ہے۔ احتشام حسین کے اس نظریئے سے اختلاف کے باوجود ان کے اخلاص و انہماک سے انکار ممکن نہیں ہے۔ تنقید کے بعض غیر اشتراکی نظریات کی صالح روایات بھی ان کے یہاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ احتشام حسین نے پہلی مرتبہ ماضی کی صالح ادبی و تنقیدی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مارکسی تنقید کے اصول و نظریات مرتب کئے۔ انہوں نے مغربی افکار اور اشتراکی نظریات کا مطالعہ کر کے ان کو اپنے انداز سے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ دنیا کی اکثر زبانوں میں مارکسی تنقید وجود میں آچکی ہے۔ انگریزی تنقید کا مطالعہ کرنے والا طبقہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ جدید تنقید میں جدلیاتی نقطہ نظر پر اس میں ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ احتشام حسین نے جو کچھ نظریاتی تنقید پر لکھا ہے اس میں کوئی ندرت نہیں بلکہ انہوں نے ایک ایسے فلسفہ ادب کی تشریح کی جو عالمی اور آفاقی بن چکا تھا اور جو دوسری زبانوں میں ترقی یافتہ شکل میں موجود تھا۔ احتشام حسین نے پہلی مرتبہ ماضی کی صالح ادبی و تنقیدی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مارکسی تنقید کے اصول و نظریات مرتب کئے دھیرے دھیرے ان کے ذہنی ارتقا کے ساتھ ساتھ ادبی تصورات، تنقیدی نظریات عملی تنقید اور اسلوب تنقید میں بھی پختگی آتی گئی۔

احتشام حسین نے اپنی بصیرت و آگہی سے اردو تنقید کے فن کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ان کی عملی تنقید کے ذریعہ پہلی بار ترقی پسند تنقید مارکسی پروپیگنڈے سے آگے بڑھی اور اس طرح تنقید کو وقار اور اعتبار حاصل ہوا اور ترقی پسند تنقید باہر سے آئی ہوئی خام شئے معلوم ہونے کی بجائے مشرقی اور ہندوستانی رنگ میں رنگ کر سامنے آنے لگی۔ احتشام حسین کی نظریاتی و

عملی تنقید کی تمام تر خوبیاں سماجی و معاشرتی علوم سے آگہی، تاریخی حقائق پر نظر اور جمالیاتی بصیرت و احساس سے مکمل واقفیت کی بنا پر ہے اور ان کی نقادانہ شخصیت میں انہیں خوبیوں کے یکجا ہو جانے کی وجہ سے ان کی نظریاتی اور عملی تنقید اور اسلوب تنقید نے ترقی پسند تنقید میں بے انتہا اضافہ کیا۔

احتشام حسین بنیادی طور پر سماجی نظریات کے حامیوں میں ہیں۔ وہ ادب کو اس گرد و پیش اور ماحول کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ ان کا یقین کامل ہے کہ ادب میں حسن، دلکشی اور جاذبیت، اس کا تاثر اور قبولیت سب اسے سماج سے ملتا ہے۔ فنکار جس ماحول اور جس سماج میں رہتا ہے وہیں سے اپنی تخلیق کے لئے خام مواد اکٹھا کرتا ہے وہ لکھتے ہیں:-

> ''ادب کے تخلیقی کارنامے ان حقیقتوں کا عکس ہوتے ہیں جو سماج میں پائی جاتی ہیں...... ادیب کے گرد و پیش کی دنیا اس کا حسن، اس کی بدصورتی اس کی کشمکش اور اس کا الجھاؤ اس میں بسنے والوں کی امیدیں اور مایوسیاں، خواب اور امنگیں، رنگ روپ، بہار اور خزاں اس کے موضوع ہوتے ہیں۔''(۱)

اس اقتباس سے احتشام حسین کے نظریے کی بڑی حد تک وضاحت ہو جاتی ہے۔ احتشام حسین کے تنقیدی کارناموں کا ایک اچھا ذخیرہ موجود ہے، اور بعض بعض موقعوں پر اپنے نقطہ نظر کی وضاحت انہوں نے بڑی خوبی سے کی ہے۔ وہ اردو کے کلاسیکی ادب کی عظمت اور خوبی سے بڑی حد تک آگاہ ہیں۔ اس کا احترام کرتے ہیں۔ ایک نہیں مختلف مواقع پر انہوں نے اس کا اظہار کھل کر کیا ہے اور ترقی پسند تحریک و تنقید کے سلسلے میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ نقاد کے لئے جدید و قدیم ادب کی آگہی کو انہوں نے لازمی قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے

---

(۱) ''عکس اور آئینے''، احتشام حسین، ۱۹۷۰ء

کہ اس سلسلے میں ذرا سی لغزش بھی نقاد کو اپنی ڈگر سے ہٹا سکتی ہے وہ لکھتے ہیں :-

"شاعری کو سمجھنے اور اس کے افادی پہلو یا حسن کے راز سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے علوم قدیم اور علوم جدیدہ دونوں کا علم ضروری ہے کیونکہ آج کا انسانی شعور ماضی کے شعور سے تعلق رکھتا ہے اس لئے آج بھی کئی حیثیتوں سے ماضی کے علم کے بغیر حال کا مکمل علم حاصل نہیں ہوسکتا، لیکن نئی شاعری کے قدیم تصور رکھنے والے نقاد جن چیزوں کو خود جانتے ہیں صرف انہیں کو اہمیت دیتے ہیں اور اگر کوئی بات ان کے علم کے باہر کہی جائے تو اسے بہم کہتے ہیں یا پھر اس کو شاعری کو موضوع ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے لاعلمی یا کم علمی کے ساتھ تنقید نگاری نہیں چل سکتی۔" (۱)

"اردو ادب کی تنقیدی تاریخ" کے علاوہ تنقید میں احتشام حسین کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے، لیکن اس سے ان کی ناقدانہ عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا ہے۔ ان کا تنقیدی سرمایہ ان کے تنقید مضامین کے مجموعے ہیں اور یہ مجموعے ان کے تنقیدی دائرے کو مکمل کرتے ہیں۔ ان کے تمام تنقیدی مضامین میں ان کے نقطہ نظر کی واضح جھلک ملتی ہے۔ انہوں نے ادبا اور شعرا کی کتابوں پر پیش لفظ اور مقدمے بھی تحریر کیے۔ ان سے بھی ان کے تنقیدی مزاج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ یہ پیش لفظ اور مقدمے خیال خاطر احباب کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے نقطہ نظر کی وضاحت ان میں ہوئی ہیں۔ ایک اور بات جو ان کی تنقیدی نگارشات میں نمایاں ہے وہ یہ کہ انہوں نے کہیں بھی علمی مسودے بازی نہیں کی ہے اور اپنے موقف کا سودا نہیں کیا ہے۔ احتشام حسین ایک کشادہ قلب و ذہن کے مالک

---

(۱) "تنقیدی نظریات"، احتشام حسین، ص ۴۵

تھے اور اپنے خلاف لکھی جانے والی تحریروں کو بھی آنکھوں کا سرمہ بناتے تھے۔

''تنقیدی جائزے'' احتشام حسین صاحب کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ احتشام حسین صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۹ء سے شروع کیا اور تادم حیات یعنی ۱۹۷۲ء تک مسلسل لکھتے رہے اور تنقید کو اپنے افکار و نظریات سے مالا مال کرتے رہے۔ احتشام حسین صاحب نے جس زمانے میں قلم سنبھالا وہ دور جدید و قدیم کی تشکیل کا زمانہ تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ۱۹۳۶ء میں ہو چکا تھا، احتشام حسین آزادی رائے کے قائل تھے اور اس معاملے میں غور و فکر کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ترقی پسندی کی تحریک کے متوسلین ادب میں چند سیاسی نعروں کو درآمد کر رہے تھے۔ ان کا زور اس تحریک کے مخالفین نے نہیں بلکہ احتشام حسین کے مضامین نے توڑا۔ مارکسی نقطہ نظر سے اپنی تمام تر دلچسپیوں کے باوصف انہوں نیا ادب کو کمتر درجے کی چیز نہیں سمجھا۔ وہ صرف نقاد ہی نہیں بلکہ ادیب اور شاعر میں بلندی وفکر، وسعت مطالعہ اور پختگی شعور دیکھنا چاہتے تھے۔ آج اردو میں ایسی تخلیقات کا قابل لحاظ ذخیرہ موجود ہے جو نغمہ کے لحاظ سے مارکسی اور لے کے اعتبار سے ہندوستانی ہے۔ مارکسی نقادوں کی صف میں صرف احتشام حسین کی شخصیت ایسی نظر آتی ہے جن کے مضامین توازن اور سنجیدگی قائم رکھنے پر زور دیتے رہے۔

احتشام حسین کی نگاہ ادب کی تاریخی اہمیت پر بھی تھی اور ادب کی سماجی و جمالیاتی اہمیت پر بھی وہ ادب کو زندہ، متحرک اور ترقی پذیر سمجھتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جو ادب زندگی کی گتھیاں نہ سلجھائے اس کو صحیح راستہ نہ دکھائے وہ حقیقت میں ادب نہیں ہے، لیکن ایسا ادب بغیر تنقید کے وجود میں نہیں آتا ہے اور تنقید اس وقت تک مفید اور صالح نہیں ہوگی جب تک نقاد اپنے فرائض و منصب سے بخوبی آگاہ نہ ہو۔ اس سلسلے میں احتشام حسین لکھتے ہیں:-

> ''اس کا مقصد و منتہا صرف ان کیفیات کی باز آفرینی نہیں ہے جو شاعر پر گذر چکی ہیں۔ نقطہ نظر کی یہ حد بندی نقاد کی تخلیقی صلاحیتوں

کو سلب کر لیتی ہے اور نقد و نظر بے معنی فعل ہو کر رہ جاتے ہیں۔
نقاد کا اپنا ایک ضمیر، اس کی اپنی خودی، اس کا اپنا وجود ہوتا ہے جو
مبصر اور شارح کی طرح کچھ دور چل کر شاعر اور تصنیف کے پائے
میں پناہ نہیں لیتا بلکہ شاعر کا سینہ اور ادب کا دل چیر کر اندر جھانکتا
ہے اور دیکھتا ہے کہ اس میں کہاں کہاں تک حقائق سے آنکھیں
چار کرنے کی جرأت کی تھی۔''(۱)

اس کے علاوہ بھی وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

''نقاد کسی طرح بھی آنکھیں بند کر کے کیفیات و محسوسات کا مطالعہ
نہیں کر سکتا۔ نقاد کو اپنی نظر اس کی اپنی بصیرت، اس کے نقد کو تخلیقی
بنا سکتی ہے۔ اپنی نظر ہی نقاد کا وہ حربہ ہے جسے الگ رکھ کر وہ نقاد
باقی نہیں رہ سکتا۔''(۲)

اس لحاظ سے نقاد پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ اس کی اپنی نظر بڑی محنت اور ریاضت چاہتی ہے۔ جب تک اس کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا نہ ہوگا، عالمی ادب پر اس کی نگاہ گہری نہ ہوگی، عصر حاضر کے تقاضوں سے بہرہ ور نہ ہوگا، فن کار اور فن کا رمز شناس نہ ہوگا اس وقت تک اس کے اندر تنقیدی صلاحیت و بصیرت پیدا نہیں ہو سکتی۔ نقاد کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی ادیب، شاعر یا فن کار میں زندگی کے نقش کتنے گہرے ملتے ہیں، حقیقتوں پر اس کی کتنی نگاہ ہے سب کا جائزہ لے۔ اس کے لئے فنکار اور اہل ہنر کے خیالات کی درستی پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔

---

(۱) ''روایت اور بغاوت''، احتشام حسین، ۱۹۴۷ء، ص ۹۷

(۲) ''روایت اور بغاوت''، احتشام حسین، ۱۹۴۷ء، ص ۸۲

احتشام حسین نے ادب اور تنقید کو زندگی اور اس کے مسائل سے قریب تر کر دیا ہے۔ وہ ایک سماجی حقیقت نگار ہیں اور فن کی تعبیر و تشریح جدلیاتی مادیت کے تحت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب کو سماجی ترقی کے آلہ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہئے۔ وہ فنکار کی تخلیق میں سماجی، معاشی اور نفسیاتی عوامل کی تلاش و جستجو کرتے ہیں۔ ادب کو زندگی کی کشمکش میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ احتشام صاحب ادب میں فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہیں لیکن مواد کو ہیئت پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے مضامین اردو کے ترقی پسند ادب کا ایک بیش بہا اور نا قابل فراموش سرمایہ ہیں۔ تنقید میں ان کے سائنٹفک نظریات پر کسی طرح بھی مارکسی انتہا پسندی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ مارکس کے اشتراکی نظریے سے متاثر ضرور ہیں اور ادب کو سماجی، تاریخی، تہذیبی، معاشی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کا آئینہ سمجھتے ہیں لیکن فن کی قدروں کے تعین میں جمالیاتی حسن، تاثراتی دلکشی، نفسیاتی دروں بینی اور زندگی کی جدلیاتی حقیقت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ احتشام صاحب اپنی زندگی کے آخری ایام تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور اپنی بیش بہا تحریروں سے اس تحریکمیں معنویت، گہرائی اور ہمہ گیری و وسعت پیدا کی۔ انہوں نے اردو کے قدیم و جدید ادب کی مختلف اصناف کو سماجی حقیقت نگاری کے آئینے میں پرکھا۔ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ان کے موقف اور خیالات و نظریات کی وضاحت بہ آسانی ہو جاتی ہے:۔

> ''ترقی پسندی کچھ بھی نہیں ہے اگر وہ کسی بندھے ٹکے اصول کے ماتحت ہر مسئلے کا فیصلہ کر دیتی ہے یا اگر وہ ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانک دیتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کا خیال ہے کہ ہر ادیب اپنے سماجی شعور کی بنا پر اپنے طبقاتی رشتے میں اپنے معاشرتی عقائد اور فنی تصورات کی روشنی میں ایک نیا مسئلہ پیش کرتا ہے۔ ہر ادیب کے خیالات کا کوئی پس منظر ہوتا ہے۔ اس کی تخئیل کا کوئی خزانہ ہوتا

ہے۔ اس کے انتخاب اور اجتناب کا کوئی اصول ہوتا ہے۔ انسانی شعور کی پیچیدگیوں کو سلجھا کر فن کار کے اصل مقصد کو ڈھونڈ نکالنا، اس کے فن کے محرکات کا پتہ لگا لینا اچھے ترقی پسند نقاد کا کام ہے۔ اگر وہ اپنے اس ہمہ گیر اور ہر جہتی سماجی شعور سے کام نہ لے تو ان ادیبوں اور فنکاروں کے علاوہ جو سو فی صدی اس کے ہم خیال ہیں اور کسی کو وہ ادیب اور فنکار تسلیم ہی نہ کرے۔ جو ادیب سماجی ارتقاء کی جس منزل میں ہے اسی کی مناسبت سے وہ جانچا جا سکتا ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اس کی ترقی پسندی یا عدم ترقی پسندی کے متعلق رائے قائم کی جا سکتی ہے۔'' (۱)

مواد اور ہیئت کے تعلق سے احتشام حسین صاحب کا ادبی موقف ملاحظہ ہو:۔

''......شاعری نئے اسلوب میں ہو یا پرانے، شاعر کے لئے اپنے مواد پر قدرت، اس سے خلوص، احساس کی شدت کے ساتھ ساتھ زبان پر قدرت کی بھی ضرورت ہے۔ اسے رنگ و صوت نغمہ و ترنم کی ان تمام لطافتوں سے کام لینا چاہئے جس کا مواد دل و دماغ پر چھا جائے اور سننے والے میں عمل کی طاقت پیدا کر دے۔ مواد اور ہیئت کے اسی اتحاد کا نام فن ہے۔'' (۲)

کامیاب ادب میں مواد اور ہیئت دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں کی اہمیت کو احتشام حسین نے ہر جگہ مدنظر رکھا ہے۔ احتشام حسین کے تنقیدی شعور نے پہلی

---

(۱) ''تنقید اور عملی تنقید''، احتشام حسین، ۱۹۶۱ء، ص ۱۴۷

(۲) ''تنقیدی جائزے''، احتشام حسین، ص ۲۷

مرتبہ تنقید کا رشتہ آگہی سے جوڑ دیا انہوں نے مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کی تاریخ، جاگیردارانہ نظام کی بے راہ روی، طبقاتی کشمکش، صنعتی انقلاب، جدوجہد آزادی اور اس کے درمیان سیاسی، سماجی، مذہبی تحریکات کا بغور مطالعہ کیا اور ان ادوار میں اردو ادب کے مختلف رجحانات کا تجزیہ کر کے طبقاتی کشمکش اور دیگر تحریکات کے اثرات اور نتائج پر روشنی ڈالی ہے:-

> ''انگریز نے اپنی پرانی جاگیرداری کا خاتمہ کر کے وفادار قسم کی نئی جاگیرداری پیدا کی۔ صنعتی انقلاب جو تقریباً ساری دنیا میں اپنا اثر پھیلا رہا تھا ہندوستان میں شروع ہو کر رہ گیا۔ اس لئے یہاں کی شاعری اور ادب میں دونوں لہریں ساتھ ساتھ چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، جن لوگوں کا تعلق دکن، رامپور وغیرہ کے درباروں سے رہا ان کی دنیا نہ بدلی۔ جو باہر نکل کر زندگی کی کشمکش میں شامل ہو گئے وہ جدید تحریک کے علمبردار بن گئے۔''(۱)

۱۸۵۷ء کی تحریک نے جاگیردارانہ نظام کو رسمی طور پر ختم کر کے ایک وفادار قوت میں تبدیل کیا وہیں متوسط طبقے کو بھی جنم دیا جس نے آئندہ اپنی مخصوص حدود میں رہ کر ہندوستان کے پورے سماج اور ادب میں اصلاحی تحریکوں کی علمبرداری کی۔ پھر انیسویں صدی میں پوری قوم کے جسم میں وطنیت کی ایک لہر دوڑ گئی پھر جنگ عظیم کا سامنا ہوا۔ یہ جنگ اپنے ساتھ تباہ کاریاں بھی لائی۔ دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا ہوا۔ احتشام حسین کی زبانی اس کا حال ملاحظہ کیجئے:-

> ''.....اگرچہ غدر کے بعد ایسا کوئی انقلاب ہندوستان میں نہیں ہوا

---

(۱) ''تنقیدی جائزے''، احتشام حسین، ص ۲۹

تھا لیکن ساری دنیا میں جو انقلاب ہو رہا تھا اس کا اثر بہت گہرا پڑا۔ نظام معاشرت، تمدن، مذہب، سیاسی ادارے طریقۂ تعلیم، علم و ادب ہر چیز کی قدروں کی جانچ اور پرکھ نئے طریقہ سے شروع ہوئی۔ قدیم چیزوں پر سے ایمان اٹھنے لگا۔ مزاجوں میں ایک طرح کی جھنجھلاہٹ اور غصہ پیدا ہوا، اور اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہونے لگا۔ ادب میں بھی ایک طرح کی تغیر پسندی Radicalism قدامت سے چھیڑ چھاڑ، روایتوں سے بغاوت کا ایسا شدید اظہار ملتا ہے جو غدر کے بعد کے تغیرات میں نہیں ملتا۔ اس نئی بغاوت میں مذہب اور اخلاق، معاشی اور سیاسی ادارے سب پر حملے کئے گئے۔ قدیم کے ساتھ جو تقدس کا خیال شامل تھا جھوٹے طلسم کی طرح باطل ہو گیا اور جس طرح کی آزادی خارجی حالات میں نہیں پیدا ہو سکتی تھی وہ خیالات میں پیدا کی جانے لگی۔" (۱)

احتشام حسین ہمیشہ تاریخ کے پس منظر میں اردو ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ادب کا مقصد ان کے نزدیک انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ کسی فن پارے کی جانچ پرکھ سے پہلے وہ تاریخی اور سماجی عوامل کی جستجو کرتے ہیں پھر یہ دیکھتے ہیں کہ فنکار نے حالات سے کس قسم کے اثرات قبول کئے ہیں اور اپنے ماحول اور زمانے کی ترجمانی میں وہ کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ س طریقہ کار کی ایک عمدہ مثال ان کے مقالہ "غالب کا تفکر" ہے۔ اس مقالے میں وہ غالبؔ جیسے انفرادیت پسند شاعر کے شعور کی بنیادوں کا پتہ لگانے کے لئے غالبؔ کے عہد کی تاریخ پر نظر رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

---

(۱) "تنقیدی جائزے"، احتشام حسین، ص ۱۳۵

"......جو باتیں غالبؔ کے مطالعے کے لئے مفید ہو سکتی ہیں ان میں سب سے اہم اس دور کی تاریخی کشمکش، روایات اور اس سے انحراف کا مطالعہ ہے۔ اس مرکزی مسئلے کی جستجو بھی مفید ہو گی جو ذہن و شعور پر اپنا عکس ڈالتا ہے۔ یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ امرا کیا تاریخی حیثیت رکھتے تھے اور دوسرے طبقات سے ان کا کیا تعلق تھا۔ کوئی نیا طبقہ بن رہا تھا یا نہیں اگر بن رہا تھا تو اس کی کیا خصوصیات تھیں۔ کوئی شاعر یا فنکار اس میں اپنی خواہشوں اور امنگوں کی جھلک دیکھ سکتا تھا یا نہیں۔ یہ بات کچھ تو اس طبقے کی واضح اور معین حیثیت نمایاں ہونے پر مبنی ہو گی اور کچھ شاعر کے سماجی اور طبقاتی شعور پر نیم شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہونا بھی ممکن ہے لیکن اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

حالات کی اس پیچیدگی سے گھبرا کر اکثر نقاد محض نفسیات کی روشنی میں غالبؔ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ نفسیات خود خارجی عوامل کا نتیجہ ہے اور زبردست انفرادیت بھی مثبت یا منفی شکل میں ایک بنیاد رکھتی ہے نفسیاتی کیفیت خارجی حالات سے باہر کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتی۔" (۱)

احتشام حسین نے اردو تنقید کو نئی وسعت و رفعت ہی نہیں بخشی، صرف عصری وابستگی کی بصیرت ہی نہیں دی بلکہ ایک نیا طریقہ کار بھی دیا اس طریقہ کار کے مطابق پہلے کسی شاعر یا ادیب کے زمانے پر غور کرنا ضروری ہے اس دور کی اہم اقدار، عقائد اور خیالات کا جائزہ لینا

---

(۱) "تنقید اور عملی تنقید"، ۱۹۵۲ء، ص ۲۷

ضروری ہے پھر اس شاعر یا ادیب کی اپنی سیرت، اس کے طبقاتی رشتے تعلیم، دوست احباب، خاندان، مشاغل اور اس کی دلچسپیوں کے ذریعہ اس کے مزاج تک رسائی حاصل کرنا چاہئے پھر اس کی شاعری یا اس کے ادب میں ظاہر ہونے والے خیالات میں اس کی شخصیت اور اس کے زمانے کی گونج تلاش کرنا چاہئے۔

عام طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مارکسی نقاد شخصی رجحانات کی مخالفت کرتے ہیں ان کا تعلق افراد سے زیادہ عوام سے ہوتا ہے۔ یہ ایسے رجحانات کی بھی مخالفت کرتے ہیں جو فرد کو سماج سے کاٹ دیتے ہیں۔ احتشام حسین اس قسم کے الزامات سے بری ہیں۔ وہ فنکار کی شخصیت کو پیش کرنے کے لئے کوشاں رہے۔ انہوں نے کبھی بھی مصنف کی ذات پر خود کو مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ فنکار کی شخصیت اجاگر کرنے کے لئے اس کی شخصیت کے متضاد و عناصر اور میلانات تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے اتنی بات سمجھ میں آتی ہے کہ تنقید کا مارکسی نظریہ رکھنے کے باوجود انہوں نے دوسرے ادبی نظریوں سے بھی استفادہ کیا ہے اور وہاں سے بھی ایسی بنیادی باتیں اخذ کی ہیں جن سے ان کے نقطہ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔ ان کے بہت سے تنقیدی مضامین جیسے "حالی اور پیروئ مغرب" نظیر اکبر آبادی، جگر مراد آبادی، غالبؔ کا تفکر، شبلیؔ اور موازنہ انیس و دبیر وغیرہ ایسے مضامین ہیں جن سے ان کی تنقید کے عملی پہلو کی نمائندگی ہوتی ہے۔

احتشام حسین صاحب اپنے تنقیدی نظریات پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ کچھ بھی لکھنے سے پہلے اس موضوع پر سنجیدگی سے غور وخوض کر لیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بعض مضامین میں جگہ جگہ تنقید کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور سخن شناسی کے اصول مرتب کئے ہیں۔ ادب کے مقصد و منصب کی تشریح کرتے ہوئے بھی وہ قطعیت سے کام لیتے ہیں۔ مختلف موضوعات جیسے اصول نقد، شعر فہمی، ادب اور اخلاق، مواد اور ہیئت، تنقید اور عملی تنقید، ادبی تنقید کے مسائل، ادب اور تہذیب، فرقہ پرستی اور ادب، ادب کا مادی تصور اور میں کیا لکھتا ہوں وغیرہ

عنوانات کے تحت انہوں نے نظریاتی بحثیں کی ہیں اور ہر مسئلے کا مکمل، دلچسپ اور دل نشیں جواب بھی دیا ہے۔ میدان نقد میں احتشام حسین کی ایک اور خصوصیت ان کا اسلوب بیان ہے وہ اس کی اہمیت پر خاصہ زور دیتے ہیں۔ خیالات کی مناسبت سے چست ترکیبیں اور درست فقرے استعمال کرتے ہیں اور ساتھ ہی طرز اظہار پر بھی کافی توجہ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عبارت کا ہر فقرہ نپا تلا اور چست درست ہوتا ہے۔ ان کی تحریر سنجیدہ، معنی خیز اور شگفتہ ہوتی ہے۔ ساتھ ہی قاری کو دعوت فکر بھی دیتی ہے۔ عبارت میں توازن واعتدال کے ساتھ تسلسل بھی بے انتہا پایا جاتا ہے۔ بعض ناقدین اس بات کے شاکی ہیں کہ احتشام حسین کی تنقید میں جمالیاتی احساس نہیں ملتا وہ ادب کے سماجی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی بات غلط فہمی کی بنیاد پر کہی جاتی ہے۔ احتشام حسین کے مضامین میں جمالیاتی نقطہ نظر کی کارفرمائی بدرجہ اتم دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے مضامین میں جمالیات کے متعلق اصولی مباحث کی نشاندہی بھی کی جا سکتی ہے۔ احتشام حسین کے درج ذیل اقتباس سے ان کے جمالیاتی نقطہ نظر کی وضاحت ہو سکتی ہے:۔

> ''جمالیاتی نقادوں کی پہنچ شعر و ادب کی خوبیوں تک ایک گہرے وجدان کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور ایک قسم کا صوفیانہ شعور ان کا رہنما ہوتا ہے۔ یہ کہیں بھی مکمل طور پر ادب کے اجتماعی اور سماجی محرکات کا پتہ نہیں دیتی ہے۔ اس تنقید سے انہیں آسودگی خاص نہیں ہوتی جو ادب کو اجتماعی کشمکش کا مظہر مانتے ہیں۔''(۱)

تنقید اور تخلیق کے باہمی رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ادب کے تخلیقی عمل میں ہی تنقیدی شعور کی بھی نمو ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ساتھ

---

(۱) ''تنقید اور عملی تنقید''، احتشام حسین، ص ۱۹۴

ساتھ چلتے ہیں تخلیقی ادب پیدا کرنے والا اپنے جذبات، خیالات اور تجربات کو ترتیب دے کر ایک خاص اسلوب کے ساتھ پیش کرتا ہے لیکن اس کی وہ تنقیدی صلاحیت جسے وہ ابتدا میں اپنے خیالات کی تہذیب اور تنظیم میں صرف کرتا ہے بعض نفسیاتی اثرات اور وفور جذبات کی وجہ سے کافی نہیں ہوتی پھر بھی وہ صلاحیت جتنی قوی ہوگی تخلیقی کارنامہ اسی قدر اعلیٰ وارفع ہوگا۔ احتشام حسین نے مجموعی حیثیت سے اردو تنقید کے فکر اور فن میں بیش بہا اور قابل قدر اضافے کیئے ہیں۔ انہوں نے اپنے معاصرین اور نئی نسل کے تنقید نگاروں کو جس درجہ متاثر کیا ہے حالیؔ کے بعد دوسرے ناقد نے نہیں کیا ہے۔

احتشام حسین نہ صرف یہ کہ زندگی اور ادب کا مارکسی نقطہ نظر رکھتے تھے بلکہ اس نقطہ نظر کے پرجوش اور سرگرم مبلغ بھی تھے یہاں تک کہ اشتراکی تحریک و تنظیم سے ان کی گہری وابستگی تھی۔ اس کے ساتھ وہ ایک صاحب قلم اور باذوق انسان بھی تھے، ان کا مطالعہ وسیع اور احساس وشعور گہرا تھا۔ اشتراکی اور ترقی پسند تنقید کے بعض عناصر کی موجودگی کے باوجود انہوں نے اسے قبول نہیں کیا کیونکہ اجتماعی زندگی کی اس سے بہتر ترجمانی کرنے والا، ادب کو تہذیب کے ارتقاء اور زندگی کی جدوجہد کا آلہ کار قرار دینے والا دوسرا تنقیدی دبستان ان کے سامنے تھا۔ ان کے پاس ایک چابکدست اسلوب بیان بھی تھا۔ وہ تجزیے، استنباط، نتائج اور ترتیب افکار کی بھی زبردست صلاحیت رکھتے تھے۔ ان اوصاف کی بنا پر ان کے ایک بالغ نظر اور پروقار نقاد ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

احتشام حسین نے ادب اور تنقید پر کوئی مبسوط کتاب یا مقالہ لکھ کر اصول نقد کی تشکیل نہیں کی لیکن اپنے تصنیفی سرمائے میں اصول اور نظریات پر کسی مفصل اور مستقل ادبی اور تصنیفی کمی کا انہیں شدت سے احساس تھا جس کا اظہار انہوں نے اکثر کیا ہے۔ اس کے باوجود انہیں یہ بھی احساس تھا کہ ان کے بعض مضامین برسوں کے غور وفکر اور محنت شاقہ کا نتیجہ ہیں اور اپنے موضوع کے اعتبار سے تنقید اور مسائل تنقید کے ایسے اہم پہلو اجاگر کرتے ہیں جن کی حیثیت

ادب اور تنقید کے سرمائے میں کلیدی ہے۔ اس سے ان کے مقالات و مضامین کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

احتشام حسین کو تنقیدی عمل کے دوران مختلف تنقیدی مسائل سے عہدہ برآ ہونا پڑا اور متنوع تنقیدی اصول ونظریات کا ادراک حاصل کرنے کے لئے مختلف مراحل سے گذرنا پڑا تب جا کرانہوں نے اپنے مضامین میں ادب اور تنقید کی ماہیت، تعلق، دائرہ کار، مواد، ہیئت اور اسلوب کا تعلق واضح کیا۔ ان کی نظریاتی تنقید میں مختلف اصناف ادب اور اصناف سخن کے تقاضے، ادب اور تنقید کی غیر جانبداری، مختلف تنقیدی مکاتب فکر کے محاسن و مصائب کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ احتشام حسین کا تصور ادب کیا ہے اس ضمن میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> ''بعض لوگوں کے لئے ادب رومانی، الہامی، اور مابعد الطبعیاتی ہے۔ بعضوں کے لئے مادی ہے۔ بعض ادب کی قدروں کو ناقابل تغیر مانتے ہیں بعض تغیر پذیر۔ بعض لفظوں کو سب کچھ سمجھتے ہیں بعض خیالات کو الفاظ پر ترجیح دیتے ہیں۔'' (۱)

احتشام حسین ادب کو زندگی کی طرح تغیر پذیر مانتے ہیں اور ضرورتوں کے تحت بدلنے والا اور ارتقاء پذیر فن سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق فن بذات خود سماجی اظہار کا تقاضہ کرتا ہے اسی بنا پر اس کے لئے تنقید کا وجود ناگزیر ہے۔ اعلیٰ ادب بغیر تنقید کے پیدا نہیں ہوسکتا اور جب تک نقاد اپنے فرائض کا پوری طرح خیال نہیں رکھے تنقید اعلیٰ درجے کی ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا نقاد کو فقط ان کیفیات کی باز آفرینی تک محدود نہیں رہنا چاہئے جن سے تخلیقی عمل کے دوران شاعر یا ادیب دوچار ہوا تھا یا دوچار ہوتا ہے۔

یہ سوال بھی اپنی جگہ اٹھایا جاسکتا ہے کہ ادبی وغیر ادبی قدریں کہاں سے آتی ہیں اور

---

(۱) ''تنقیدی جائزے''، احتشام حسین، ص ۷

تنقیدی اصول کس طرح مرتب ہوتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ شعروادب کی دنیا انسانی تجربے سے الگ کوئی وجودنہیں رکھتی بلکہ وہ انفرادی ہوتے ہوئے بھی ہر حالت میں زندگی کی عام صداقتوں پر مبنی ہوتی ہے اس حقیقت کے پیش نظر احتشام حسین رقمطراز ہیں:۔

''جس طرح ادب زندگی کی سمت کو سمجھے بغیر اچھا ادب نہیں بن سکتا اسی طرح تنقید اچھے ادب کو پیش نظر رکھے بغیر چند اصولوں کا مجموعہ نہیں بن سکتی۔ تنقید کے اصول ادب ہی کے اندر سے وضع کیے گئے ہیں، اگر وہ باہر سے ادب پر لادے جائیں تو انہیں تنقید نہیں کہا جاسکتا۔''(۱)

حالؔی کے بعد اردو تنقید میں احتشام حسین ہی تنقید اوراس کا فن اس کے اجزائے ترکیبی وغیرہ سے متعلق مختلف سوالات اٹھانے والے نقاد ہیں ان کا غیر معمولی ذہن ان کے مطالعے کی وسعت اوران کے توانا شعور نے تنقید کے میدان میں انہیں اعتبار بخشا ہے۔ نظریاتی اعتبار سے دقیق اور باریک ادبی وتنقیدی سوالات اٹھانا اور انہیں اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کرنا، فلسفیانہ دلیلیں پیش کرنا ان کے نظریہ ساز نقاد ہونے کی دلیل ہے۔ بحیثیت مجموعی نظریاتی اعتبار سے وہ سماجی اور عمرانی نقاد ہیں اسی لئے ادب اور سماج کے آپسی رشتے کو ادب کے تنقیدی مطالعے میں اہمیت دیتے ہیں۔ حالؔی نے اپنے زمانے میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ ''قوت متخیلہ کوئی شئے بغیر مادے کے پیدا نہیں کر سکتی'' اس جملے کو آگے بڑھاتے ہوئے احتشام نے لکھا ہے کہ ''خیال بغیر مادے کے پیدا نہیں ہوتا'' اس جملے کو انہوں نے اپنے نقطہ نظر کے ترجمان کے طور پر بار بار اور جگہ جگہ نقل کیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''خیال کہاں سے پیدا ہوتا ہے اور کہاں سے اپنے لئے مواد حاصل

---

(۱) ''تنقید اور عملی تنقید''، احتشام حسین، ص ۱۶

کرتا ہے۔ کیا خیال مادے سے ہی پیدا ہوتا ہے چاہے قوت متخیلہ
اس میں کتنی ہی رنگ آمیزی کرے تو پھر فلسفہ مادیت وہ اہم مبحث
ہمارے سامنے آئے گا جو یہ بتاتا ہے کہ پہلے مادی کا وجود ہے پھر
شعور، اوراک اور عمل اس لئے شعور، اوراک اور خیال کی حیثیت
بھی مادی ہے۔''(۱)

اس نظریے کو ثابت کرنے میں احتشام حسین دلائل سے کام لیتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ ادب اور زندگی کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نقاد مادی اور تاریخی جدلیت پر یقین رکھے بغیر مادی عناصر پر خصوصی توجہ دیئے بغیر حقائق تک نہیں پہنچ سکتا۔ ان کے نظریئے کے مطابق کسی دور کے شعروادب کا اجتماعی اور سماجی پس منظر میں جائزہ کئے بغیر تنقید کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ ترقی پسند ناقدین جمالیاتی اقدار کی پاسداری بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تنقید معاشیات کا کوئی شعبہ بن کر رہ جاتی ہے۔ لیکن احتشام حسین اس معاملے میں بھی اعتدال وتوازن قائم رکھتے ہیں وہ لکھتے ہیں:۔

''ادب کی جمالیاتی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی سماجی اہمیت کو دیکھنا
ضروری ہے کیونکہ ادب زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کتاب کی ادبی
اہمیت کے دوش بدوش اس پہلو کو بھی دیکھنا ضروری ہے جس میں
طبقاتی اور دوسرے رجحانات سانس لیتے ہوئے دکھاتی دیتے ہیں
جس میں رجحانات جذبات کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں
جہاں شعوری اور غیر شعوری طور پر ادیبوں نے کسی سماجی نظام سے

---

(۱) ''روایت اور بغاوت''، ۱۹۴۷ء، ص ۴۸

بغاوت یا ہمدردی کا اظہار کیا۔ نئے علوم کی روشنی میں قدیم ادب کا
جائزہ لینا ادبی اور لفظی موشگافیوں سے آگے جا کر ہمیں انسانوں کی
اس بستی میں پہنچا دیتا ہے، مصنف خود جس کا ایک فرد تھا اور جس کی
اچھائیوں اور برائیوں کو سمجھ کر اس نئی آنے والی نسلوں یا خود اپنے
زمانے کے لوگوں کو زندگی کو سمجھنے کی دعوت دی۔''(۱)

احتشام حسین مختلف تنقیدی مکاتب فکر سے واقف تھے۔ ان کے اصول ونظریات اور محاسن ومعائب پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ ان کی روشنی میں انہوں نے اپنے تنقیدی اصول ونظریات کی تشکیل کی اور اپنے لئے ایک راہ ہموار کی۔ جس زمانے میں انہوں نے تنقید کی ابتدا کی ان کے سامنے تاثراتی اور جمالیاتی دبستان تنقید، موضوعاتی تنقید، ہیئتی واساطیری تنقید، تاریخی تنقید، تقابلی تنقید، سائنٹفک تنقید، نفسیاتی تنقید، مارکسی تنقید وغیرہ موجود تھیں ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے اس پر عمل درآمد ضروری تھا چنانچہ احتشام حسین نے ان تمام دبستانوں کے اصول و نظریات اور عملی تنقید پر غور وفکر کے بعد اشتراکی اور سماجی وعمرانی تنقید کا مسلک اپنے لئے منتخب کیا لیکن ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے تنقید کے دیگر دبستانوں کو یکسر نظر انداز کر دیا بلکہ ان دبستانوں کے اصول ونظریات سے بھی استفادہ کرتے رہے۔ انہوں نے ان مکاتب فکر کی خوبیوں اور خامیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ تاثراتی تنقید کی بے اصولی کو ناپسند کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:۔

''وہ نقاد جو ہر ادبی کارنامے پر سر دھنتا، ہر ادیب اور ہر شاعر کو پسند کرتا
ہے اور کسی نقطہ نظر سے تعرض نہیں کرتا بقول آسکر وائلڈ اس کا حال اس
نیلام کرنے والے کا سا ہے جو ہر مال کے تعریف کرتا ہے۔''(۲)

---

(۱) ''تنقیدی جائزے''، احتشام حسین، ص ۹۳

(۲) ''تنقید اور عملی تنقید''، احتشام حسین، ص ۶۳

اس طرح جمالیاتی تنقید ان کے نقطہ نظر کے مطابق اس لئے قابل قبول نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ ادب کے اجتماعی اور سماجی محرکات کا پتہ نہیں لگایا جا سکتا ہے۔

سائنٹفک تنقید کا علمبردار مشہور فرانسیسی نقاد ٹین ہے۔ اس نے اپنے پیش رو نقاد پرڈر کے نظریات باضابطہ طور پر سائنٹفک انداز سے پیش کئے اور بتایا کہ یہ دبستان تنقید سائنس کی طرح فن اور فنکار کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔ اردو میں ترقی پسند تنقید سے پہلے باقاعدہ نہ سہی لیکن سرسید کی اصلاحی اور علمی وادبی تحریک کے زیراثر سائنٹفک تنقید کی بنیاد ضرور پڑ چکی تھی۔ بحیثیت مجموعی حالؔی کو اردو کا پہلا سائنٹفک نقاد قرار دیا جاتا ہے۔ بعد میں مجنوؔں گورکھپوری بھی تاثراتی تنقید کے دائرے سے نکل کر سائنٹفک تنقید کی راہ سے ہوتے ہوئے ترقی پسند تنقید تک آ گئے۔ ترقی پسند ناقدوں میں سب سے زیادہ معتبر اور کامیاب احتشام حسین تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کی عملی تنقید کا افق سب سے زیادہ روشن ہے۔ عملی تنقید کے تعلق سے ایک جگہ احتشام حسین لکھتے ہیں:-

> ''......میں صرف ادب پاروں کے لفظی ومعنوی تجزیے اور تشریح کو عملی تنقید نہیں سمجھتا بلکہ سارے تنقید عمل کو جو کسی تنقیدی نقطہ نظر کے ماتحت ہو عملی تنقید کہتا ہوں۔ اس وجہ سے میں نے کہیں کہیں اصول تنقید کے لئے نظریہ اور اس کے اطلاق اور استعمال کے لئے عمل کے لفظ سے کام لیا ہے اس مفہوم میں عملی تنقید کا دائرہ وسیع رہے گویا میں نے اس لفظ کو کسی مخصوص اصلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ تقریباً لغوی مفہوم ہی تک استعمال کیا ہے۔''(۱)

احتشام حسین کے تنقیدی مضامین کا جائزہ لینے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ ۱۹۳۶ء سے

---

(۱) ''تنقید اور عملی تنقید''، احتشام حسین، ص ۱۰

۱۹۵۱ء تک نظریاتی تنقید سے وابستہ رہے پھر عملی تنقید کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کی تنقید کا وہ زمانہ جو "تنقید اور عملی تنقید" کے بعد شروع ہوتا ہے اس میں وہ اشتراکیت کے علمبردار سے زیادہ ادب شناس کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اس دور میں ان کی عملی تنقید کے وقیع سرمائے کا موازنہ ان کے معاصرین سے کرایا جائے تو کیفیت اور کمیت دونوں لحاظ سے کوئی ان کا ہمسر نہیں ہے بعض شاعروں نے جیسے غالبؔ، اقبالؔ، حالیؔ، جوشؔ، مجازؔ وغیرہ پر جو انہوں نے مختلف اوقات میں مضامین لکھے ہیں اگر انہیں یکجا کر دیا جائے تو ان کی عملی تنقید کے مجموعے بہ آسانی مرتب ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ انہوں نے نظریاتی تنقید سے کہیں زیادہ عملی تنقید سے متعلق لکھا ہے، ان کی عملی تنقید کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی نہایت اہم ہے کہ وہ بنیادی طور پر مارکسی اور اشتراکی نقطہ نظر کے حامل ہیں۔

اب آیئے احتشام حسین کے چند مضامین کے حوالے سے ان کی تنقید نگاری کا جائزہ لینے کی کوشش کریں۔ غالبؔ اور اقبالؔ اردو کے ان خوش نصیب شعراء میں ہیں جن سے متعلق سب سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ باوجود اس کے ان شعراء کا حق بہت کم ناقدین نے ادا کیا ہے اور جن معدودے چند ناقدین نے بھرپور طور پر حق ادا کیا ہے ان میں احتشام حسین صف اول میں آتے ہیں۔ انہوں نے ان شعراء کا مطالعہ مختلف زاویوں سے کیا ہے اور ایسے اچھوتے اور چونکا دینے والے سوالات و نکات اٹھائے ہیں جن کے جوابات ان سے پہلے کے ناقدین کے یہاں نہیں ملتے ہیں۔ احتشام حسین نے اپنے تنقیدی مضامین "غالبؔ کی بت شکنی" اور "غالبؔ کا تفکر" میں اپنے مخصوص نظریات کے پس منظر میں طبقاتی کشمکش اور تاریخی جدلیت کے سہارے مطالعے کی عام روش سے ہٹ کر جائزہ لیا ہے۔ اپنے مقابلے "غالب کی بت شکنی" میں غالبؔ کے جن اشعار کے حوالے سے انہیں روایت شکن قرار دیا ہے بعض دوسرے ناقدین نے غالب پر لکھتے ہوئے ان اشعار کو عارفانہ خیالات پر مبنی قرار دیا ہے۔ لیکن احتشام حسین کا باشعور ذہن پہلی ہی منزل میں یہ سمجھ جاتا ہے کہ غالبؔ کی شاعری مادی حقیقتوں کی نفی

نہیں کرتی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"غالبؔ ان حقیقتوں کی نفی نہیں کر سکتے تھے جو ان کی مادی زندگی پر اثر انداز ہوئی تھیں وہ 'میں' کا بت نہ توپاش پاش کرنا چاہتے اور نہ ان کے امکان میں تھا کہ مکمل تخریب کر کے کائنات سے زندگی کی آگ بجھا دیں۔ ان کی انفرادیت اور خودستائش تو کوئی اور ہی خواب دیکھ رہی تھی:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا۔" (۱)

احتشامؔ کو غالبؔ کی شاعری میں نہ صرف رسم وتقلید پرستی کے خلاف احتجاج محسوس ہوا بلکہ ان کے یہاں بت شکنی کی گونج بھی ملی۔ ان کے نزدیک زندگی کو نئے تجربات کو راہ پر لگانا، بندھے ٹکے اصولوں سے انحراف کر کے زندگی کی نئی قدروں کی جستجو کرنا بت شکنی ہے اور یہ عمل خیال کی دنیا میں غالبؔ بار بار دہراتے رہتے تھے۔

"غالبؔ کی بت شکنی" میں مطالعہ غالبؔ کے جو پہلو تشنہ رہ گئے تھے احتشام حسین نے انہیں اپنے دوسرے مضمون "غالبؔ کا تفکر" کے ذریعہ مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک طویل مضمون ہے اور اس کے ابتدائی تقریباً نصف حصے میں غالبؔ کے ماحول، اس عہد کے سماجی تصورات، طبقاتی کشمکش زندگی کے تقاضے، پسماندہ طبقوں کے حقوق کا استحصال وغیرہ موضوع سے بحث کی گئی ہے اور پھر اس پس منظر میں غالبؔ کے فکر وفن کے آئینے میں ان کے افکار وخیالات ونظریات واحساسات کی بنیادوں کا سراغ لگایا گیا ہے نیز ان کی شخصیت اور ان کے عہد کے عرفان کی کوشش کی گئی ہے۔ احتشام حسین نے غالبؔ کے مزاج کا تجزیہ کرتے

---

(۱) "ادب اور سماج"، ص ۱۱۹

ہوئے ان تمام عجمی اور ہندی اثرات کا سراغ لگایا ہے جن کا تعلق ان کے زمانے کی تہذیب سے تھا اور جن سے وہ دوچار تھے اور آخر یہ نتیجہ نکالا ہے:-

> ''غالبؔ کی شاعری اپنے سارے غم واندوہ کے باوجود ہمارا قیمتی تہذیبی سرمایہ ہے جس میں ان کی شخصیت کی رعنائی نے زندگی سے رس نچوڑے ہیں اور آلام روزگار سے ٹکر لینے کی کوشش نے توانائی پیدا کردی ہے۔''(۱)

غالبؔ کے تفکر پر بھرپور روشنی ڈالنے کے بعد وہ غالبؔ کی چند خامیوں اور تضاد کی طرف بھی نشاندہی کرتے ہیں پھر غالبؔ کا دفاع کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایسا فلسفہ جو تضاد سے خالی ہو یا خامیوں سے یکسر پاک ہو محض غیر طبقاتی اشتراکی سماج میں جنم لے سکتا ہے۔ محمد حسن نے ''غالب کا تفکر'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میرے نزدیک غالبؔ کا تفکر ان کا سب سے اچھا مقالہ ہے اور یقیناً اردو تنقید کے چند مثالی مقالوں میں شامل ہونے کے قابل ہے۔

اسی طرح اقبالؔ کی شاعری پر لکھتے ہوئے وہ اس مسئلے کو اٹھاتے ہیں کہ اقبالؔ کے بعض مخالفین یا موافقین کا کہنا ہے کہ اقبالؔ کے اندر خلاقانہ قوت کی نہایت کمی تھی۔ ان کی شاعری میں پیش ہونے والا فلسفہ کوئی نیا فلسفہ نہیں ہے بلکہ حالیؔ، غالبؔ، اکبرؔ وغیرہ کی روایات کا تسلسل ہے اور پرانے مسلمان علماء اور یورپی فلسفیوں کے یہاں سے مستعار لیا گیا ہے۔ پھر اس کا خود ہی جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اردو شاعری میں اس لحاظ سے ان کا کوئی مماثل نہیں کہ انہوں نے ایک جاندار مفکرانہ نقطۂ نظر پیدا کیا۔ شاعری کو نیا مواد دیا۔ فنی وسعتیں بخشیں، مادی، اخلاقی اور روحانی مسائل پر غور کرنے کے نئے راستے دکھائے۔ شاعری میں نئی طاقت اور گہرائی، نیا نصب العین سے زور پیدا کیا اور انہیں اسالیب کے نئے سانچوں میں ڈھالا۔

---

(۱) ''تنقید اور عملی تنقید''، احتشام حسین، ص ۱۰۶

احتشام حسین نے اقبالؔ سے متعلق اپنے مضمون ''اقبالؔ بہ حیثیت شاعر اور فلسفی'' میں اقبالؔ کے مختلف تصورات، تصورِ خودی، ابلیس اور مردِ مومن وغیرہ پر تبصرہ و تجزیہ کرتے ہوئے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اقبالؔ کے یہاں یہ تصورات کن عناصر سے ترتیب پاتے ہیں۔ اقبالؔ کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:-

''وہ (اقبال) عظیم الشان شخصیت کی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں جو اپنی نسل کے دماغ کو اپنے جوش کی شدت، اپنے انسان دوستی کے نقطہ نظر، اور انسان کے شاندار مستقبل کی امید سے متحرک کرتی ہے۔ اگر ان کے فلسفے کی تفصیلات سے الگ ہو کر دنیا کی ترقی پسند طاقتوں کے مخصوص رجحانات کے متعلق ان کے فیوض کا جائزہ لیں تو یہ معلوم ہوگا کہ ان کے افکار انہیں ہر زمانے کے بڑے شعرا کے جھرمٹ میں جگہ دلائیں گے۔ فن برائے زندگی کے متعلق اقبالؔ کے جو اعتراضات اور خیالات ہیں انہیں دیکھ کر کوئی انہیں لفظوں کا بازیگر نہیں کہہ سکتا گو انہیں الفاظ پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی ان کی فنی عظمت کا اظہار ان کے شاعرانہ مزاج سے ہوتا ہے جس میں روایت اور بغاوت کا امتزاج ہوتا ہے۔ انہوں نے اردو فارسی کے بہترین شعراء سے بہترین ورثہ پایا ہے۔ اور اس میں اپنے طرزِ اظہار کے نئے پن اور احساس کی تازگی سے اپنی قوتِ متخیلہ اور اپنی شخصیت کے زور سے رنگا رنگی اور وسعت پیدا کرتے تھے۔ اقبالؔ کا جذبہ عمل ان کا عقیدہ، عظمتِ انسانی اور انسان کی بے پناہ قوت میں یقین، جسم و روح کی غلامی سے ان کی نفرت اور ان کا رجائی اندازِ نظر سب ملا کر موجودہ زندگی کے لئے عمل پسندی کا نشان اور

ایک بڑی طاقت بن جاتے ہیں۔"(۱)

احتشام حسین کے اس اقتباس کے پیش نظر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ احتشام حسین اقبال کی شاعری اور فلسفے کے کھلے دل سے معترف تھے۔ وہ اقبال کی فکر کے قدرداں تھے۔ غالب کا تفکر ہو یا اقبال کا شعر و فلسفہ، مجموعی اعتبار سے احتشام حسین ان دونوں اکابر شعراء کے مداح تھے اور ان دونوں سے متعلق ان کے فکر انگیز مقالے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں، چنانچہ اس ضمن میں پروفیسر عبد المغنی نے لکھا ہے:۔

"اقبال اور غالب پر ان کے مطالعات اردو تنقید میں اہم اضافے ہیں۔ غالب کا تفکر اور اقبال کی رجائیت کا تجزیہ اردو تنقید کی تاریخ میں ادب عالیہ کے نمونے ہیں۔"(۲)

"اقبال کی رجائیت کا تجزیہ" سے کہیں بہتر مضمون "اقبال بہ حیثیت شاعر اور فلسفی" ہے اس مضمون کا ذکر میں اوپر کر چکی ہوں۔ اسی طرح حسرت کا رنگ سخن اور حسرت کی غزلوں میں نشاطیہ عنصر احتشام حسین کے حسرت سے متعلق معرکۃ الآرا مضامین ہیں۔ ان مضامین میں احتشام حسین اردو شاعری کے مسلسل ارتقاء کی روشنی میں حسرت کے مقام و مرتبے کا تعین کرتے ہوئے انہیں اپنے دور کا بڑا غزل گو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں پائی جانے والی لطافت، تازگی اور شگفتگی کے راز کا پتہ لگاتے ہوئے وہ حسرت کی شاعری کے بنیادی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ:۔

"غزل کا انتخاب حسرت کے کردار کے بعض پہلوؤں کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ایسے پہلو جو قدیم تہذیبی اور اخلاقی خصوصیات

---

(۱) "روایت اور بغاوت"، احتشام حسین، ص ۱۱۵

(۲) "احتشام حسین کی تنقید نگاری"، مشمولہ: ماہنامہ "نقش کوکن"، بمبئی، احتشام حسین نمبر، ص ۳۰

کے حامل تھے اور تغزل کے لئے جس پر کیف، مہم آزما اور بے چین زندگی کی ضرورت ہے اس سے بھرے ہوئے تھے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو حسرت کی شخصیت اور شاعری میں یہ ہم آہنگی نظر نہ آتی اور نہ وہ ایک کامیاب شاعر ہوتے۔ بہر حال تمام اصناف سخن میں غزل کا انتخاب حسرت کے رنگ طبیعت کا غماز ہے اور ان کا رشتہ کلاسیکی شاعری کی سب سے مقبول اور ہر دل عزیزی صنف سے جوڑ دیتا ہے۔"(۱)

احتشام حسین کا خیال ہے کہ حسرت کی غزل گوئی میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ انہوں نے اپنا رشتہ سخن ان قدیم اساتذہ سے جوڑ رکھا ہے جنہوں نے شاعری کی بہترین میراث عطا کی ہے، یعنی ان کا سلسلہ تسلیم، نسیم، مومن جیسے قدیم اساتذہ سے مل جاتا ہے۔ خود حسرت کا بیان ہے:

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

احتشام حسین کا خیال ہے کہ حسرت کے نگار خانہ غزل میں کئی اساتذہ سخن کی تصویریں نظر آتی ہیں، لیکن اس نگار خانے کی مجموعی بہار اور رونق اپنا ایک الگ حسن رکھتی ہے۔ ان کے رنگ سخن میں جو آراستگی اور شائستگی ہے اس کی مشاطگی صدیوں کے تہذیبی ارتقاء نے کی ہے حسرت سے متعلق اس مضمون کے سلسلے میں اپنی رائے دیتے ہوئے جناب ڈاکٹر عبدالمغنی یوں رقمطراز ہیں:-

"حسرت کا رنگ سخن ایک ایسے موضوع پر ہے جس پر قلم اٹھانے

---

(۱) "تنقید اور عملی تنقید"، احتشام حسین، ص ۲۰۲

کے لئے تنقید اور عملی تنقید کے بعض موضوعی تعصبات سے زیادہ شعر فہمی کی معروضی غیر جانبداری کی ضرورت ہے، یہی وجہ ہے کہ تنقیدی نقطہ نظر سے یہ مضمون زیادہ بھرپور، بصیرت افروز اور موثر ہے اور اعلیٰ تنقید کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس میں احتشام حسین کی تنقیدی صلاحیت اپنے عروج پر ہے اور وہ بغیر کسی ذہنی الجھن کے اپنے فن کے کمال کا پورا مظاہرہ کر پائے ہیں۔ اس واقعے سے ایک بار پھر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اپنے نظریاتی تحفظات و تاملات کے باوجود احتشام حسین ایک سچے اور کھرے نقاد تھے۔''(۱)

اس طرح فانیؔ بدایونی، نظیرؔ اکبر آبادی، پریمؔ چند، اخترؔ شیرانی، اکبرؔ الہ آبادی، جگرؔ مراد آبادی، آتشؔ وغیرہ کی شاعری سے متعلق لکھے گئے مضامین احتشام حسین کے اعتدال پسندانہ مگر منطقی رویے کے شاہد ہیں۔ ان مضامین اور ان کے علاوہ دیگر مضامین کے مطالعے سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ احتشام حسین صاحب موقع ومحل کے اعتبار سے اپنے تنقیدی اصول میں لچک پیدا کر لیتے ہیں یعنی وہ ہر جگہ اقتصادیات، معاشیات وغیرہ کی گتھیوں میں گم ہو کر نہیں رہ جاتے ہیں۔ مذکورہ مضامین کا مطالعہ یہ ثابت کر دیتا ہے کہ وہ ہر جگہ بندھے ٹکے اصولوں کے پابند ہو کر نہیں رہتے ہیں۔

احتشام حسین نے جدید اور ہمعصر ادب پر بھی مضامین قلم بند کئے ہیں جیسے جوشؔ ملیح آبادی کی شخصیت کے چند نقوش، شادؔ عارفی کا فن، سردارؔ جعفری۔ رومان سے انقلاب تک، مجازؔ۔ فکر وفن کے چند پہلو، ہمصفیر انقلاب مخدومؔ، جمیلؔ مظہری کی شاعری میں فکری عنصر، کرشنؔ چندر کی افسانہ نگاری، فیضؔ کی انفرادیت، نئی شاعری کا پس منظر، جدید اردو ڈرامہ، اردو ناول اور سماجی

(۱)''احتشام حسین اور عملی تنقید''، ڈاکٹر عبدالمغنی، ماہنامہ ''آہنگ''، گیا، احتشام حسین نمبر، ص ۶۰

شعور وغیرہ ان کے قابل قدر مضامین ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ایک جگہ لکھا ہے کہ بعض ہمعصروں پر ان کے مضامین میں میرے نزدیک ترجمانی اور تحسین (Appreciation) کا پہلو زیادہ نمایاں ہے قدر آفرینی (Evaluation) نسبتاً کم۔ آل احمد سرور کی یہ رائے یقینی طور پر درست ہے مگر اس کا سبب احتشام حسین کی نرم خو طبیعت ہے۔ وہ شریف النفس انسان تھے۔ ماہنامہ ''ادب لطیف'' لاہور کے مدیر کو اس ضمن کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ان کا بیان ملاحظہ کیجئے:-

> ''جی ہاں ہمعصروں پر لکھنے میں اکثر جھجک محسوس ہوئی ہے۔ ممکن ہے یہ میری فطری کمزوری ہو۔ مجھے آبگینوں کو ٹھیس لگانے میں لطف نہیں آتا۔ جہاں تک ہو سکتا ہے اس سے بچتا ہوں۔ نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کا دل دکھے۔ کوشش کرتا ہوں کہ ہمعصروں کی تخلیقات کے زیادہ سے زیادہ اچھے پہلوؤں کا ذکر کروں، انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتا ہوں اور کمزوریوں پر ہمدردانہ نگاہ ڈالتا ہوں۔ اگر مجبوراً ایسی باتوں کا ذکر کرنا ہی پڑتا ہے جو مجھے نادرست معلوم ہوتی ہیں تو ان کا اظہار بھی دل آزادی کے انداز میں نہیں کرتا۔'' (۱)

شاید یہی سبب ہے کہ ہمعصروں سے متعلق لکھے گئے بعض مضامین میں ان پر جانبداری کا الزام لگایا جاتا ہے۔ جگہ جگہ وہ تضاد، الجھن اور تکرار کا بھی شکار ہوئے ہیں۔ یہ نقائص ان کے قدیم شاعروں اور ادب سے متعلق لکھے گئے مضامین میں نہیں کے برابر پائے جاتے ہیں۔

***

---

(۱) ''اعتبار نظر'' (مقدمے کے طور پر) ص ۹

احتشام حسین کے چند معاصر نقاد

احتشام حسین کی عہد آفریں شخصیت اردو ادب کے افق پر زندہ و تابندہ ہے۔ کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے اپنے معاصرین میں ان کا مقام سب سے بلند ہے۔ انہوں نے تواتر کے ساتھ اپنے موقف میں وضاحت بھی کی ہے۔ ان کی تنقید سے اردو تنقید میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے ''تنقیدی جائزے'' سے لے کر ''جدید ادب۔ منظر و پس منظر'' تک ان کے جتنے مضامین کے مجموعے شائع ہوئے، ان کے مطالعے سے تنقید میں ان کے اصول و نظریات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ گذشتہ باب میں احتشام حسین کی تنقید نگاری کا اپنی بساط بھر جائزہ لے چکی ہوں زیر نظر باب میں احتشام حسین کے چند معاصرین کی ناقدانہ حیثیت سے متعلق بحث مقصود ہے اور آخر میں ان معاصرین میں احتشام حسین کے ناقدانہ مرتبے کا تعین کرنا ہے۔

احتشام حسین کے معاصرین میں جن کے اسلوب انفرادیت کے حامل ہیں اور جن کا نام اولین فہرست میں آسکتا ہے، ان میں مجنوں گورکھپوری، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، ممتاز حسین، اختر اورینوی اور ڈاکٹر محمد حسن کے نام قابل ذکر ہیں۔ ذیل میں سب سے پہلے بالترتیب ان ناقدین کی تنقیدی حیثیت کا جائزہ پیش کر رہی ہوں۔

مجنوں گورکھپوری : ترقی پسند ناقدین میں مجنوں گورکھپوری ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ابتدا میں ان کے یہاں جمالیاتی اور تاثراتی نقطہ نظر غالب رہا چنانچہ ان کے مضامین کے پہلے مجموعے ''تنقیدی حاشئے'' میں جو مضامین شامل ہیں ان میں تاثراتی نقطہ نظر کارفرما نظر آتا ہے اور ان میں بھی اکثر جذباتیت اور عقیدت کی کارفرمائی ملتی ہے۔ زندگی کی جذباتی کیفیتوں اور جمالیاتی پہلوؤں پر زیادہ روشنی ملتی ہے۔ مثلاً میرؔ کے فن سے زیادہ انہوں نے میرؔ کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے اور ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:-

> ''اردو شاعری بھی اپنا خدا رکھتی اور وہ میر کہلاتا ہے۔ تذکرہ نویسوں نے بالا جماع اس کی درگاہ میں اپنی حمد و ثنا پیش کی ہے۔ شعراء نے اس کے آگے سر بندگی جھکایا ہے۔ کوئی تذکرہ نویس یا کوئی شاعر ایسا نہیں ملے گا جس نے میرؔ کے خدائے سخن ہونے سے انکار کیا ہو۔'' (۱)

مصحفی سے متعلق بھی ان کا ایک اقتباس دیکھئے:-

> ''مصحفی کا کلام چاہے وہ خارجی پہلو رکھتا ہو یا داخلی ایک کیفیت کا حامل ہوتا ہے ان کی شاعری ارتسامی ہوتی ہے ان کے محاکات حسن کاری ایک خاص بصیرت لئے ہوئے ہوتے ہیں۔'' (۲)

مجنوں گورکھپوری کے جمالیاتی اور تاثراتی نقطہ نظر سے متعلق ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے:-

> ''فنون لطیفہ اور بالخصوص شاعری موسیقی اور مصوری کی سب سے بڑی

---

(۱) ''تنقیدی حاشیے''، ص ۹

(۲) ''نکات مجنوں''، ص ۱۳۲

خصوصیت یہی ہے کہ ان کے تاثرات کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا اور شاعری تو اپنے راز کو بھی افشا نہیں ہونے دیتی۔ ہم لاکھ نکتے نکالیں پھر بھی ہم واضح طور پر نہ خود جانتے نہ دوسروں کو بتا سکتے ہیں کہ فلاں شعر ہم کو کیوں اچھا معلوم ہوتا ہے۔'' (۱)

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ مجنوں گورکھپوری جس کسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں تو وہ وجدانی اور تاثراتی ہوتا ہے۔ کسی شاعر کی اہمیت ان کے یہاں اس لئے زیادہ ہے کہ اس کے یہاں تاثر اور مسرت و کیفیت زیادہ ہے اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجنوں تنقیدی ذوق و وجدان کے قائل اور اسے جذبات و تاثرات سے الگ کر کے نہیں دیکھ پاتے۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۵ء تک ملتا ہے۔ اس کے بعد وہ جلد ہی اس انداز کی تنقید نگاری سے دست بردار ہو گئے اور مارکسی تنقید کو بہتر انداز تنقید قرار دیا اور مارکس کے نظریات کے پیش نظر ادب کا مطالعہ شروع کیا اور اس فلسفے کو اپنی تنقید میں اپنا لیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''ادب بھی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور زندگی نام ہے ایک جدلیاتی حرکت کا جس کے ہمیشہ دو متضاد پہلو ہوتے ہیں۔ ادب بھی ایک جدلیاتی حرکت ہے۔ ایک تو خارجی یا عملی یا افادی دوسرا داخلی یا تخیلی یا جمالیاتی۔ حسن یا ادب کا یہ کام ہے کہ وہ بظاہر دو متضاد میلانات کے درمیان توازن اور ہم آہنگی قائم کرے ورنہ اس میں جہاں ایک پلہ بھاری ہوا وہیں فساد اور انتشار پیدا ہوا۔'' (۲)

مجنوں گورکھپوری کا اہم تنقیدی کارنامہ ''ادب اور زندگی'' ہے اس کتاب میں انہوں نے

---

(۱) ''تنقیدی حاشیے''، ص ۲۴

(۲) ''ادب اور زندگی''، ص ۲۹

ادب اور زندگی کے باہمی رشتوں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ زندگی کے ساتھ ساتھ ادب بھی کس طرح تبدیلیاں قبول کرتا ہے، نئے سانچے اور نئے آہنگ کس طرح ابھر کر سامنے آتے ہیں اور پرانے تصورات و نظریات بدل جاتے ہیں ان تمام پہلوؤں پر مجنوںؔ نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور مثالیں پیش کی ہیں۔ انہوں نے زندگی کے مختلف ادوار اور اس دور میں تخلیق ہونے والی ادب تخلیقات سے ثابت کیا ہے کہ زمانے کے ساتھ ادب میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ ابتدائی زمانہ پروہت کال کہلاتا ہے۔ اس کال میں یونان میں ہومرؔ نے ایلڈ اور اوڈیسی کی تخلیق کی۔ ہندوستان میں ''وید''، ''مہابھارت'' اور ''رامائن'' لکھی گئیں پھر وہ شہنشاہی دور کا بیان کرتے ہیں جو ظلم و بربریت کا دور تھا۔ اس دور کی تخلیقات جو مولانا رومؔ، حافظؔ، کبیرؔ اور میرا بائی کے کارنامے ہیں، ان سب کے ذریعہ خاموش احتجاج کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ پھر مہاجنی دور آیا اور رومانی شعرا نے بساط ادب بچھائی۔ یہ دور درمیانی طبقے کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے اور پست طبقہ کے عروج کا زمانہ آیا اور مارکسی رجحانات نے ظلم و استحصال کے خلاف آواز بلند کی۔ اس عہد میں اخوت و مساوات، اشتراکیت، امن و سلامتی اور انسانی فلاح و بہبود کے مقاصد کی جھلک ادب میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ ادب ماحول اور سماج کی پیداوار ہے۔ مجنوںؔ ادب اور ادیب کی سماجی اہمیت کے قائل نظر آتے ہیں اور مارکس کے جدلیاتی نظریے کے پیش نظر ادبی تخلیقات کو پرکھتے ہیں۔ وہ ادب کو زندگی کا ترجمان ہی نہیں سمجھتے بلکہ اسے زندگی کا نقاد بھی تسلیم کرتے ہیں۔ جس طرح مارکسؔ نے زندگی کو ایک جدلیاتی قوت کا تابع بتایا ہے اسی طرح مجنوںؔ بھی زندگی کو ایک نامیاتی قوت قرار دیتے ہیں۔ مجنوںؔ گورکھپوری کی تنقید میں جو اہم بات پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ مغرب اور مشرق میں ایک توازن اور اعتدال رکھنا چاہتے ہیں۔ مارکسی نقطہ نظر کی پیروی کے باوجود جمالیاتی اور دوسرے فنی محاسن پر نظر رکھتے ہیں اس سلسلے میں سید سبط حسن رقمطراز ہیں:۔

''مجنوں صاحب کے دور سے پہلے تنقید نگاری کا دائرہ بہت تنگ تھا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہمارے بزرگ نقاد مثلاً آزاد، حالی اور شبلی مغربی علوم وادبیات سے قریب قریب ناواقف تھے۔ مجنوں صاحب اردو، فارسی اور عربی ادب پر عبور رکھتے ہی ہیں وہ مغربی علوم وادب پر بھی حاوی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ کالج میں انگریزی ادب ہی پڑھایا کرتے تھے۔ مجنوں صاحب اوران کے ہم عصر نقادوں نے تنقید نگاری کے میدان میں جو اضافے کئے، جونئی راہیں نکالیں ان پرتو کوئی سکہ بند نقاد ہی تبصرہ کرسکتا ہے۔ ہم تو فقط اتنا جانتے ہیں کہ مجنوں صاحب ترقی پسند ادب کے بانیوں میں سے ہیں۔ بلکہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے آغاز سے پہلے بھی وہ زندگی اور ادب کی ترقی پسند اقدار ہی کی ترجمانی کیا کرتے تھے۔ ترقی پسند ادب کے اصول ونظریات کا تعین کرنے والوں میں مجنوں کا نام سرفہرست ہے۔''(۱)

مجنوں گورکھپوری کا خیال ہے کہ انسان کو زمانے کی ہوا کا ساتھ دینا چاہئے اور اپنے خیال اور اپنی سوچ میں اعتدال سے کام لینا چاہئے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے مارکسی فلسفہ سے متاثر ہونے کے باوجود تاریخی، جمالیاتی، تاثراتی، معاشرتی اور مارکسی خیالات کے میل ملاپ سے سائنٹفک تنقید کی بنیاد رکھی۔ ان کا خیال تھا کہ کسی ادبی شہ پارے کو محض کسی ایک پیمانے سے نہیں جانچا جاسکتا بلکہ مختلف آلات کے ذریعہ اس کی پرکھ ہوتا کہ فن پارے کی صحیح قدروقیمت کا تعین ہوسکے۔

مجنوں گورکھپوری نے مارکسی فلسفے کی آسان اور عام فہم تفسیر پیش کی ہے۔ ان معنوں میں

---

(۱) ''مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں'' مطبوعہ دوماہی ''الفاظ'' علی گڑھ، جنوری تا اپریل ۱۹۸۳ء

یہ پہلے ترقی پسند ہیں جنہوں نے مارکسی فلسفے کی عمدہ تفسیر پیش کی اور ادب و زندگی میں تال میل پیدا کیا۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ہمارے خیالات زندگی کی صورت بدلنے میں مدد دیتے ہیں لیکن وہ خود پیداوار ہوتے ہیں زندگی کے ان تمام عناصر کی جن کو مجموعی طور پر ماحول اور زمانہ کہتے ہیں۔ مارکس اسی لئے وجود کو فکر پر مقدم سمجھتا ہے اور خیال اور عمل (Theory and Practice) کی یکجہتی پر زور دیتا ہے۔ ہم زندگی کی اس متحرک قوت کو مانتے ہیں جس کو تاریخ کہتے ہیں اور جو ایک جدلیاتی قوت ہے یعنی جو پرانی صورت کی تردید کرتی ہے کہ نئی صورت پیدا کرے جو پرانی صورت سے بہتر ہو۔" (۱)

مجنوںؔ کے مضامین ان کے نظریاتی نقطہ نظر کے غماز بھی ہیں۔ وہ عملی تنقید میں بھی مارکسی نقطہ نظر کی پیروی کرتے ہیں لیکن ان کے یہاں مارکسی جدلیاتی نقطہ نظر کے ساتھ جمالیات اور فن کے دیگر محاسن کا بھی لحاظ ملتا ہے۔ حالیؔ، نظیرؔ اور فراقؔ کی شاعری پر تبصرے عملی تنقید کے نمونے ہیں۔ وہ ادب میں واقعیت اور تخیلت، افادیت اور جمالیات، اجتماعیت اور انفرادیت سب کے قائل نظر آتے ہیں۔ وہ کلاسیکی روایات کا بھی احترام کرتے ہیں اور ادب کی نئی تعبیرات بھی ان کو عزیز ہیں۔ مجنوںؔ گورکھپوری کی تنقید سے متعلق جناب شاربؔ ردولوی رقمطراز ہیں:-

"مجنوںؔ کے تنقیدی نظریات ہمیں ان کے مختلف مضامین میں ملتے ہیں اور ان مضامین سے ان کے بارے میں جو رائے قائم کی جا سکتی ہے وہ ابتدا میں جمالیاتی اور تاثراتی اور بعد میں حقیقت پسندانہ اور مارکسی اور

---

(۱) "شعر اور غزل"، ص ۱۸۶

سائنٹفک ہے۔ وہ عملی تنقید میں بھی مارکسی نقطہ نگاہ کی پیروی کرتے ہیں لیکن یہ پیروی انتہا پسندانہ نہیں ہے جو فن کے حسن کو مجروح کرتی ہو، بلکہ ان کے یہاں مارکسی جدلیاتی نقطہ نظر کے ساتھ جمالیات اور فن کے دوسرے محاسن کا بھی احساس ملتا ہے۔ انہوں نے جہاں فراقؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے زندگی کی جدلیت کے تیز شعور کا احساس کیا ہے وہیں ان کے منفرد آہنگ، نرمی اور گھلاوٹ کی اہمیت کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس طرح عملی تنقید کے بہت سے مضامین میں انہوں نے کسی شاعر یا اس کی تخلیقات کی قدروں کا تعین کرتے ہوئے تاریخی مادیت، جدلیت، جمالیاتی حسن اور انداز و آہنگ کو بھی سامنے رکھا ہے۔ وہ کلاسیکی ادب اور روایات کا بھی اتنا ہی احترام کرتے ہیں جتنا ادب کی نئی تعبیرات کا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف تاثراتی ہونے کے باوجود مارکسی نقاد ہیں جس میں وہ واقعیت، تخیلیت، افادیت اور جمالیات کو ایک آہنگ اور اجتماعیت اور انفرادیت کو ایک مزاج دیکھنا چاہتے ہیں۔'' (۱)

متذکرہ بالا اوراق میں مجنوںؔ کی تنقید نگاری سے متعلق اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ مجنوںؔ کی نظریاتی و عملی تنقید اور اسلوب کی انفرادیت کا اندازہ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''تنقیدی حاشیئے''، ''ادب اور زندگی''، ''دوش و فردا'' اور ''نکات مجنوں'' وغیرہ سے بہ حسن و خوبی لگایا جا سکتا ہے۔

احتشام حسین کی طرح مجنوںؔ بھی اشتراکی نظریات و خیالات کے پرزور مبلغ ہیں اور فلسفہ مادی جمالیات کے قائل ہیں۔ اپنی عملی تنقید میں بھی اسے کامیابی کے ساتھ برتتے ہیں۔

---

(۱) ''جدید اردو تنقید: اصول و نظریات''، شارب ردولوی، ص ۳۶۰

احتشام حسین اور مجنوںؔ گورکھپوری دونوں کلاسیکی ادب کی عظمت کے قائل ہیں مگر دونوں کے اندازِ نظر اور طریق کار میں نمایاں فرق ہے۔

مجنوںؔ کلاسیکی ادب کی تنقید میں قدرے جذباتیت کا مظاہرہ کرتے ہیں جس سے تنقیدی مطالعے میں تاثراتی آہنگ پیدا ہو جاتا ہے، اس کے برعکس احتشام حسین کلاسیکی ادب کی عظمت کے قائل ضرور ہیں مگر اس کے قدرداں ہونے کے باوجود سماجی و عمرانی تنقید کے سائنٹفک نقطہ نظر سے انحراف نہیں کیا ہے۔

مجنوںؔ گورکھپوری اور احتشامؔ حسین دونوں کے یہاں عملی و نظریاتی تنقید میں وسعت، گہرائی و گیرائی، فکر و فلسفہ کے عناصر موجود ہیں۔ ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے دونوں کسی عہد کی معاشرتی، تہذیبی اور سماجی زندگی کے پس منظر کا سہارا لیتے ہیں۔ دونوں ادب کی جمالیاتی قدروں کے قائل ہیں۔ مجنوںؔ گورکھپوری کسی نکتے یا خیال کی وضاحت کے لیے مغربی مفکرین کے جملے یا اقوال نقل کرتے ہیں جب کہ احتشامؔ حسین اقوال نقل کرنے کی بجائے اپنے مطالعے کی روشنی میں نکات و خیالات بھی پیش کرتے ہیں اور نتائج نکالتے ہیں۔

مشہور و معروف ناقد پروفیسر آلِ احمد سرورؔ نے دونوں کے تقابل پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

> ''ترقی پسند تنقید کے سب سے اچھے نمونے ہمیں مجنوںؔ اور احتشامؔ حسین کی تنقیدوں میں ملتے ہیں۔ دونوں ہی مارکس کے تاریخی مادیت کے فلسفے سے متاثر ہیں اور اس کے جدلیاتی طریق کار کی اہمیت کو مانتے ہیں۔ مگر دونوں کے یہاں تاریخی شعور کے ساتھ کلاسیکی ادب کی عظمت کا اعتراف اور ادب کے جمالیاتی پہلو کا احساس ہے۔ گو مجنوںؔ کے یہاں یہ پہلو زیادہ واضح ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ احتشامؔ حسین کے یہاں نظریاتی مضامین زیادہ وقیع ہیں اور مجنوںؔ کے یہاں ہمارے

کلاسیکی شعرا پر مضامین۔''(۱)

کلیم الدین احمد :اردو تنقید میں کلیم الدین احمد کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اردو ادب سے متعلق ان کے اخلاقی تصورات و خیالات، انفرادی اصول و نظریات نے انہیں اردو ناقدین میں سب سے الگ مقام عطا کیا ہے۔ بعض اہل فکر تو ان کے تنقیدی احتساب پر بر بنائے غلط فہمی چونکتے ہیں اور بعض ان کے مخصوص نظریئے کی انتہا پسندی کی وجہ سے انہیں متعصب ناقد گردانتے ہیں، مگر سچ یہ ہے کہ کلیم الدین احمد نے جرات، بے باکی، استحکام نیز غیر جانبدارانہ و نیک نیتی سے ادب کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ کلیم الدین احمد اپنے تنقیدی موقف میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کے ثبوت کے طور پر ان کی تنقیدی تصانیف ''اردو شاعری پر ایک نظر''، ''اردو تنقید پر ایک نظر''''سخن ہائے گفتنی''، ''فن تنقید'' اور ''فن داستان گوئی'' پیش کی جا سکتی ہیں۔

کلیم الدین احمد نے مغربی ادب خصوصاً انگریزی ادب سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ وہ عالمی ادب میں ہونے والے تازہ ترین رجحانات اور ادبی تحریکات سے بخوبی واقف ہیں، اور مغربی ادب کے قابل قدر خیالات و نظریات کو موزوں ترین انداز سے اردو ادب سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض حضرات ان کے منفی رجحانات کے شاکی ہیں اور غیر متوازن تنقید کے باعث کلیم الدین احمد قدرے بدنام بھی ہوئے ہیں۔ باوجود اس کے اس میں کوئی شک نہیں کہ احتشام کی طرح کلیم الدین احمد بھی صف اول کے نقاد ہیں۔ ان کی متذکرہ بالا تنقیدی کتابوں سے ان کی نظریاتی و عملی تنقید کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

کلیم الدین احمد اور احتشام حسین دونوں کے انداز نظر میں اور تنقیدی فکر میں بڑا واضح فرق ہے۔ کلیم الدین احمد تاثراتی تنقید کے حامیوں میں ہونے کے باوجود مثبت پہلوؤں سے

---

(۱)''اردو میں ادبی تنقید کی صورت حال''، مشمولہ: ''نظر اور نظریے''، آل احمد سرور، ص ۹۳

کہیں زیادہ منفی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں اور بعض اوقات متضاد مضحکہ خیز نتیجہ نکالتے ہیں۔ جب کہ احتشام حسین بھی مغربی نظریات سے استفادہ کرتے ہیں مگر ان کا مطمع نظر مشرق و مغرب سے بالاتر رہتا ہے اور نتیجے کے طور پر ان کی نظریاتی تنقید مشرقی ادب کے تقاضے بحسن و خوبی پورے کرتی ہے یعنی یوں کہنا چاہئے کہ احتشام حسین صاحب کلیم الدین احمد کی طرح مغربی ادب کی پیروی کرتے ہوئے جذباتیت کو راہ نہیں دیتے ہیں اور نہ ہوش وخرد کا دامن ہاتھ سے جانے دیتے ہیں۔ کلیم الدین احمد ہمارے قدیم ادب اور ادبی سرمائے سے بیزار ہونے کے اسباب اس منزل تک پہنچ گئے ہیں کہ آل احمد سرور کو کہنا پڑا:۔

> ''کلیم الدین احمد بہت سے نقادوں سے زیادہ نئی باتیں، سوچی ہوئی باتیں اور خیال آفریں باتیں کرتے ہیں مگر ان کی تنقید اور بلند ہوتی اگر وہ اپنے قدیم سرمایہ سے اس قدر بیزار نہ ہوتے اور ان کے یہاں تاریخ اور ادب کے تسلسل کا شعور اور زیادہ نمایاں ہوتا اور ان کی تنقید گلستاں میں کانٹوں کی تلاش نہ بن جاتی۔'' (۱)

آل احمد سرور، کلیم الدین احمد کی تنقید کو گلستاں میں کانٹوں کی تلاش سے تعبیر کرتے ہیں۔ دراصل کلیم الدین احمد اپنے منفی انداز کے سبب کسی ادب یا ادیب کی فکری وفنی خصوصیات تعین کرنے میں تامل سے کام لیتے ہیں، نتیجتاً انتشار، بے ربطی اور کہیں کہیں تعصب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جب کہ احتشام حسین کے یہاں خلوص، ہمدردی، انصاف پسندی، غیر جانبداری کے عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ یہ دلیلیں بھی سوچ سمجھ کر پیش کرتے ہیں اور ان کی دلیلوں میں وزن بھی ہوتا ہے۔

کلیم الدین احمد اعلیٰ ذہن وفکر کے مالک ہیں، ان کا مطالعہ بھی غیر معمولی ہے۔ باوجود

---

(۱) ''نظر اور نظریے''، آل احمد سرور، ص ۸۸

اس کے تنقید کے بنیادی نظریات، تاریخی حقائق اور سماجی قدروں پر ان کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی ہے اور ادبی تجزیے میں ذاتی نفسیات، ذہنی و خاندانی کیفیات او قوت ادراک کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں جب کہ احتشام حسین کی تنقیدی تحریروں میں گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے اور آپ سچائی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں احتشام حسین صاحب کی تحقیر آمیز انداز میں تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ احتشام حسین صاحب کے یہاں جو کچھ ہے وہ مارکس کا عطا کردہ ہے۔ ان کے پاس اپنا کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے احتشام حسین صاحب نے بڑے تنقیدی توازن کا مظاہرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

''کلیم الدین احمد نے جو کچھ میری تنقیدوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ مارکس کا عطیہ ہے، میرے پاس خود کچھ کہنے کو نہیں ہے، میں اپنا ذکر خود بہت کرتا ہوں اور خودنمائی سے کام لیتا ہوں۔ فرائیڈ کی مبادیات سے بھی واقف نہیں ہوں، اخلاق کے معنی سے اس طرح نابلد ہوں جیسے مولانا حالیؔ۔ بات سلجھا کے نہیں الجھا کے کہتا ہوں۔ باتوں میں تضاد ہوتا ہے اور اسلوب میں بھی کوئی رنگینی نہیں ہے۔

مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر یہ سارے الزامات صحیح ہیں اور میری تحریروں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے تو مجھے لکھنا پڑھنا چھوڑ کر کوئی اور کام سنبھالنا چاہئے لیکن جب ان کی ساری کتابیں اور سارے مضامین کچھ سیکھنے سمجھنے اور اپنی اصلاح کرنے کے لئے بار بار پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہم دونوں کی تخلیق بالکل دو طرح ہوتی ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے ادبی مسائل کے متعلق متفق نہیں ہو سکیں گے۔ کچھ تو

تسکین اس بات سے بھی ہو جاتی ہے کہ جس کی کسوٹی پر میرؔ، غالبؔ، سوداؔ، مومنؔ، اقبالؔ، جوشؔ، فیضؔ، فراقؔ، آزادؔ، حالیؔ، شبلیؔ، مجنوںؔ، سرور سب ناقص ٹھہرتے ہیں، ممکن ہے اس کی کسوٹی میں ہی کوئی خرابی ہو اور اس نے لکھنے والوں کے مافی الضمیر کو سمجھنے کی کوشش نہ کی ہو یا نفسیاتی طور پر وہ ایک شخصیت رکھتا ہو جو متوازن اور صحت مند نہیں بلکہ احساس برتری یا کمتری نے اسے مریض بنا دیا ہے۔" (۱)

کلیم الدین احمد کا اسلوب تنقید تیکھا، تلخ و ترش، طنزیہ اور غیر سنجیدہ ہے۔ اس میں نظم و ضبط اور توازن و اعتدال کے بجائے جھلاہٹ اور بے اعتدالی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ جب کہ ان کے برعکس احتشامؔ حسین کے اسلوب تنقید میں نظم و ضبط خلوص، سنجیدگی اور اعتدال کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

کلیم الدین احمد کے نزدیک تنقید نام ہے موازنہ، تجزیہ، تنظیم اور دوٹوک فیصلے کا اور ان کی تحریروں میں یہی انداز نظر کار فرما نظر آتا ہے جب کہ احتشامؔ حسین نے شخصیت کو سمجھنے کے لئے سماج، ماحول اور زمانے سے واقفیت کو ضروری قرار دیا ہے۔

سچ یہ ہے کہ اردو میں تنقید کے وجود کو محض فرضی قرار دیتے ہوئے بھی اپنی عملی تنقید میں کلیم الدین احمد کوئی ایسی جدت اختیار نہیں کر پاتے ہیں جس سے اسے وسعت حاصل ہو گی اور نہ ہی نظریاتی تنقید میں انہوں نے احتشامؔ حسین کی طرح غیر معمولی وسعت پیدا کی ہے۔

آل احمد سرور: آل احمد سرور صف اول کے نقادوں میں ہیں۔ ان کی تنقید میں مشرقی و مغربی اصول و اقدار کا حسین و متوازن امتزاج ملتا ہے۔ انگریزی زبان و ادب کے گہرے مطالعے اور مشرقی زبان و ادب سے گہری وابستگی نے انہیں مخصوص نقطہ نظر اور گہری

---

(۱) "تنقید اور عملی تنقید" (دیباچہ دوم)، ص ۱۰

تنقیدی بصیرت عطا کی ہے بقول سید احتشام حسین:-

''ان کا (آل احمد سرور کا) بڑا امتیاز یہ ہے کہ سائنسی نقطہ نظر رکھتے ہوئے بھی ان کی تنقید تخلیقی اور ادبی ہوتی ہے، ان کے خیالات مدلل ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی ان کے اسلوب میں جذباتیت جھلک اٹھتی ہے۔ انگریزی ادب کا بہت اچھا مطالعہ ہونے کے باعث اپنے مضامین میں وہ اس سے بہت کام لیتے ہیں اردو مغرب و مشرق کے ادب کو سائنسی اصول تنقید سے پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ یہ بات کبھی نہیں بھولتے کہ ہر ادب اپنی ایک روایت رکھتا ہے۔ اگر کوئی اہل قلم اس روایت کو اس طرح توڑتا ہے کہ اس کے بنیادی عناصر ضائع ہو جائیں تو وہ اپنے ادب کو اونچا نہیں اٹھا سکتا۔''(۱)

آل احمد سرور بغیر غور و فکر کئے اکثر ناقدوں کی طرح مشرقی شعر و ادب کو مغربی شعر و ادب کے پیمانوں سے نہیں تولتے بلکہ ادب کے مشرقی مزاج کے مطابق غور و فکر کے بعد وہ تحقیق و تجزیہ کر کے اصول و ضوابط مقرر کرتے ہیں۔ اپنے تنقیدی نقطہ نظر کے متعلق خود ان کا خیال ہے کہ:-

''میں ادب میں پہلے ادبیت دیکھتا ہوں بعد میں کچھ اور گو یہ جانتا ہوں کہ ادب میں جان، زندگی سے ایک گہرے اور استوار تعلق سے آتی ہے میں ادب کا مقصد نہ ذہنی عیاشی سمجھتا ہوں نہ اشتراکیت کا پرچار۔ میں محض نیا یا پرانا کہلانا پسند نہیں کرتا۔ میں نیا بھی ہوں اور پرانا بھی لیکن قدرتی طور پر اپنے دور کے میلانات و خیالات سے متاثر ہوں۔ میں

---

(۱) ''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ''، احتشام حسین، ص ۳۲۲

مغربی اصولوں، نظریوں اور تجربوں سے مدد لینا اردو ادب کے لئے مفید سمجھتا ہوں مگر اس کے یہ معنی نہیں لیتا کہ اپنے تہذیبی سرمائے کے قابل قدر حصوں کو نظر انداز کر دوں۔"(۱)

آل احمد سرور کی تنقید کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور اور بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے لے کر تا حال۔ ابتدا میں انہوں نے صرف ترقی پسند تحریک کی موافقت ہی نہیں کی بلکہ اس کی علمبرداری کا کام انجام دیا۔ ادب کی جانچ اور پرکھ کے سلسلے میں تاریخی حقائق سماجی رشتوں اور تہذیبی قدروں پر زور دیا۔ آل احمد سرور کے ترقی پسند تحریک سے متعلق نظریات "تنقید کیا ہے"، "ترقی پسند تحریک پر ایک نظر"، "نئے اور پرانے چراغ"، "نیا ادبی شعور"، "ادب اور نظریہ" وغیرہ میں واضح طور پر مل جاتے ہیں۔

آل احمد سرور ترقی پسند ادیب سے مکمل طور پر اتفاق نہیں رکھتے ہیں۔ اس لئے ترقی پسند نقاد نہیں کہے جا سکتے۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور قوتِ مطالعہ سے اپنے لئے ایک الگ راہ متعین کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ جب کہ احتشام حسین کا تنقیدی رویہ نظریاتی اعتبار سے انہیں اسی سمت آنے سے روک دیتا ہے کیونکہ اپنے بنیادی نقطہ نظر کے تحفظ کا خیال ہر وقت انہیں دامن گیر رہتا ہے۔

آل احمد سرور نہ صرف ادب میں جدیدیت کے قائل ہیں بلکہ جدیدیت کے بڑے ہم نواؤں میں شمار کئے جاتے ہیں ان کا خیال ہے کہ تبدیلی زندگی کا قانون ہے۔ اس نے جدیدیت ان کے نزدیک ایک مستقل چیز ہے۔ جدیدیت سائنسی مزاج سے آشنا ہونے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا دوسرا نام ہے۔ احتشام حسین کہیں کہیں ترقی پسند اصول و نظریات کی شدت کی وجہ سے بے اعتدالی کا بھی شکار ہو گئے ہیں جب کہ آل احمد سرور نے اس سے بچنے

---

(۱) "نئے اور پرانے چراغ"، آل احمد سرور، ص ۳

کے لئے تاریخی مادیت اور اشتراکیت سے انحراف کر کے ایک نئی سائنٹفک تنقید کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

احتشام حسین اور آل احمد سرور دونوں کا مشرقی و مغربی ادب و تنقید کا مطالعہ بہت گہرا ہے دونوں کی نظریاتی و عملی تنقید میں بہت دور تک مطابقت و مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کے یہاں تنقیدی نظریات کی توضیح اور نقاد کے منصب و فرائض پر زور ملتا ہے۔ دونوں تنقید کو تخلیق کے برابر درجہ دیتے اور تنقید کا فلسفیانہ تصور رکھتے ہیں۔ جناب احتشام احمد ندوی نے دونوں کا تقابل و تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

> ''سرور صاحب حقیقت اصل شکل میں اور عیاں دیکھتے ہیں۔ احتشام حسین صاحب اس سماج، معاش اور جدلیت کے آئینے میں تلاش کرتے ہیں۔ تنقید میں ان کو برتری ان کے نظریاتی مباحث کے باعث ہے۔ سرور صاحب کی تنقیدی عظمت اُن مجموعی خوبیوں کو نمایاں کرنے میں پوشیدہ ہے جو وہ فنکار میں تلاش کرتے ہیں اور انہیں بصیرت انگیزی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔'' (۱)

احتشام ندوی کے نزدیک احتشام حسین کی عظمت کا سبب ان کی نظریاتی تنقید اور آل احمد سرور کی عظمت کا سبب فنکار کی مجموعی خوبیوں کو بصیرت انگیزی کے ساتھ نمایاں کرنا ہے اور یہ سچ بھی ہے کہ احتشام حسین کی عظمت کا سب سے مضبوط پہلوان کی نظریاتی تنقید ہے۔

نظریاتی تنقید میں احتشام حسین کی برتری خود آل احمد سرور نے بھی تسلیم کی ہے اور ناقدین کی اکثریت نے بھی اسے قبول کیا ہے۔ احتشام حسین اور آل احمد سرور عملی تنقید میں ایک دوسرے کے ہم پلہ و ہم مرتبہ ہونے کے باوجود نظریہ ساز نقاد کی حیثیت سے احتشام حسین

---

(۱) ''احتشام و سرور: ایک تقابلی مطالعہ''، ماہنامہ ''فروغ اردو''، احتشام حسین نمبر، ص ۲۴۳

آل احمد سرور پر سبقت لے جاتے ہیں۔

ممتاز حسین: پروفیسر ممتاز حسین اُن ترقی پسند ناقدین میں اہمیت کے حامل ہیں جنہوں نے ترقی پسند اصول ونظریات کی تشہیر اور ترقی پسند تحریک کی اشاعت کو اپنا مقصد بنانے کے علاوہ ادبی تخلیق اور فنی معیار کو پرکھنے کی بھی کامیاب اور سنجیدہ کوشش کی ہے۔ ممتاز حسین کا نظریہ بھی سائنٹفک ہے لیکن یہ انتہا پسندی کے عین مخالف ہیں۔ مارکسی تنقید کے نام پر بعض نقادوں نے کچھ ایسا میکانیکی انداز اختیار کرلیا کہ کمیونسٹ مینی فسٹو کو ادب پر منطبق کرنے لگے۔ ممتاز حسین ادب کی سماجی قدروں کے ہم نوا ہونے کے باوجود اس میکانیکی رویے سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ معقولیت اور استدلال کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے ہیں۔ انہوں نے مارکسی تنقید کو ہندوستان اور اردو ادب میں اپنے وقت کے اہم تقاضے اور ایک بنیادی سماجی ضرورت کے تحت پیش کیا۔ مارکسی تنقید میں خیال وعمل کی یکسانیت اور ادیب کی سماجی حیثیت پر زور دیا۔ مارکس نے ادبی ہی نہیں سیاسی وسماجی ارتقاء کا انحصار بھی معاشی ارتقاء پر رکھا ہے۔ ممتاز حسین نے اس بات کو اس حسن اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ مارکسی تنقید ہندوستانی قالب میں ڈھل جاتی ہے۔ اس ضمن میں وہ مضامین خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں جو "نئے تنقیدی گوشے" میں شامل ہیں۔ ممتاز حسین سے متعلق شارب ردولوی نے ایک جگہ لکھا ہے:-

> "ترقی پسند تنقید کی نظریاتی اساس کو متعین کرنے اور ادب پر تاریخی، تہذیبی اور سماجی عمل اور رد عمل کو پیش کرنے کا کام ممتاز حسین نے اپنی تنقیدی تحریروں کے ذریعہ کیا۔ انہوں نے سماجی نقطہ نظر کے تحت ادب کے مسائل کا تجزیہ کیا۔ ماضی کے ادب عالیہ، استعارے تنقید کے بنیادی مسائل اور غالب اور امیر خسرو پر ان کی کتابیں ان کے مارکسی اور فلسفیانہ نقطہ نظر کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ممتاز حسین ادبی مطالعے میں

طبقاتی شعور اور اس کے اثرات کو اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن فن کی ادبی اور جمالیاتی قدروں کو نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ ادبی تنقید دراصل ادب کی تنقید ہے لیکن بذات خود زندگی کی تنقید ہے۔ اس لئے ادبی تنقید لامحالہ زندگی کی تنقید بن جاتی ہے۔''(۱)

ممتاز حسین اردو کے کلاسیکی ادب کی عظمت سے آگاہ ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں۔ نقاد کے لئے جدید ادب کی آگاہی کے ساتھ ساتھ قدیم ادب کی آگاہی اور ماضی کی پہچان ممتاز حسین کے نزدیک ناگزیر ہے۔ ممتاز حسین کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:۔

''ترقی پسند نقادوں میں ممتاز حسین کو صحیح معنوں میں مارکسی نقاد کہا جا سکتا ہے۔ مارکسی ہونے کا دعویٰ تو بہت سے دوسرے ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں کو بھی ہے لیکن ان ادیبوں نے مارکسی نظریے کو پوری طرح سمجھے بغیر جوش عقیدت میں اپنا لیا ہے جن حضرات نے مارکسی فلسفہ کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے ان کے یہاں بھی مارکسزم کو پوری طرح ہضم نہ کرنے کے سبب یا فنون لطیفہ سے طبعی مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے ایک میکانیکی طریق کار ملتا ہے۔ جس نے ادب اور تنقید کے بہت سے مسائل کو سلجھانے کے بجائے اور الجھا دیا ہے۔ ان سے بعض ایسی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جن سے ترقی پسند ادیبوں کو بھی نقصان پہنچا اور ان کے اپنے شعور کی خامی نے بعض اہل نظر کو مارکسی فلسفے سے ہی بدظن کر دیا۔ ممتاز حسین نے اپنا وقیع اور گراں قدر مقالہ 'ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق' لکھ کر اس دشوار راہ کو بڑی حد تک روشن اور واضح کرنے

---

(۱) ''ترقی پسند ادب''، مرتبہ: قمر رئیس، عاشور کاظمی، ص ۵۵۷

کی کوشش کی ہے۔ یہ ان کا پہلا مقالہ ہے جس نے ترقی پسند ادبی حلقوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی اور بہت سے ادبی مجاہدین اپنے اپنے قلم لے کر میدان میں اتر آئے اور مناظرے اور مجادلے کی فضا پیدا ہوگئی۔ چونکہ ممتاز حسین کا مطالعہ مشرق و مغرب کے فلسفے کا عمومی حیثیت سے اور مارکسی فلسفے کا خصوصی حیثیت سے بہت گہرا ہے اور ادبی تاریخ کے ارتقا پر بھی ان کی نظر ہے اس لئے انہوں نے علمی دلائل کی روشنی میں اس معرکے کو سر انجام دیا اور ہمارا خیال ہے کہ کامیابی انہیں کے ہاتھ رہی۔" (۱)

احتشام حسین کی طرح ممتاز حسین بھی صف اول کے سماجی، عمرانی اور اشتراکی نقاد ہیں۔ لیکن ان کے تنقیدی نظریات احتشام حسین کے مقابلے میں قدرے محدود ہیں۔ ممتاز حسین اپنی نظریاتی تنقید میں تحلیل نفسی کے اصولوں کے احتشام حسین سے زیادہ مخالفت کرتے ہیں لیکن انہوں نے احتشام حسین کی طرح اپنے تنقیدی عمل میں داخلی رجحانات، لاشعوری کیفیات اور نفسیاتی عوامل کو تجزیے کے ذریعہ ظاہر کیا ہے۔

ممتاز حسین صاحب نے احتشام حسین کی طرح ادب میں مواد کے ساتھ ہیئت اور جمالیاتی حسن پر زور دیا ہے، ان کا کہنا ہے:-

"......لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ تنقید کرتے وقت اپنا سارا وقت خیالات کے ہی تجزیہ میں صرف کر دیں۔ یہی دیکھتے رہیں کہ آیا اس میں زندگی کا صحیح عکس اور قدروں کا احساس ہے کہ نہیں اور اس کی ہیئت، جمالیاتی جذبہ، تخئیل کی آفرینی، جذبات کی دنیا زبان کے حسن اور موسیقی

---

(۱) "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک"، خلیل الرحمٰن اعظمی، ص ۳۲۱

کو نہ دیکھیں اور پرکھیں...... کیونکہ اگر ادب سے اس کا فارم جدا کر دیا جائے تو وہ ادب کیوں کر رہے گا۔'' (۱)

اختر اورینوی: ہر چند کہ اختر اورینوی کا شمار مارکسی نقاد میں نہیں ہوتا ہے لیکن انہوں نے ترقی پسند تحریک کو نہ صرف جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی بلکہ اسے عالمی پس منظر میں بھی دیکھنے کی سعی کی ہے۔ ان کا مشہور مقالہ ''عالمی ادب اور اردو میں ترقی پسندانہ رجحانات'' ان کے تنقیدی رویے کی نشاندہی کے لئے کافی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دیگر مضامین جیسے ''ادبیات عالم اور ادب اردو میں ترقی پسندانہ رجحانات''، ''ترقی پسند ادب'' کا مطالعہ ان کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں ہوتا کہ ایک زمانے میں وہ کسی حد تک ترقی پسندی سے قربت رکھتے تھے لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اختر اورینوی اور احتشام حسین ترقی پسندی کو ادبی اظہار کا تنہا وسیلہ مانتے ہیں چنانچہ ایک لمحے کے لئے بھی وہ اپنے موقف سے ہٹنا پسند نہیں کرتے۔ اس کے برخلاف اختر اورینوی کے یہاں شروع میں بھی اعتدال کی کیفیت نمایاں ہے۔

سماج میں ادب کی اہمیت پر دونوں نقادوں نے زور دیا ہے لیکن احتشام حسین ادب کو سماجی لین دین کا ایک آلہ تصور کرتے ہیں اور اس باب میں وہ انتہا پسندی کا شکار ہیں۔ اختر اورینوی احتشام حسین کی طرح ادب کو معاشرہ کے حلقے کے اندر دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر بذات خود خاصا بحث طلب ہے لیکن یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اختر اورینوی بھی بہت سے نقادوں کی طرح ادب میں افادیت کے پہلو پر زور دیتے ہیں۔ لیکن اس زور دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ادب کو پروپیگنڈا میں ضم کر دینے کے خواہش مند ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ احتشام حسین جب ادب میں حقیقت کے موضوع سے بحث کرتے ہیں تو

---

(۱) ''تنقیدی شعور''، ص ۱۷۰

یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ادب پروپیگنڈے سے الگ کوئی شئے نہیں ہے۔ یعنی ادب کے جمالیاتی پہلو کو یکسر فراموش کر جاتے ہیں یہیں سے احتشام حسین اور اختر اورینوی کی راہیں الگ ہو جاتی ہیں۔

اختر اورینوی ترقی پسندانہ رجحانات کی نفی نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ آخر آخر وقت تک ترقی پسند ادب سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں پر خامہ فرسائی کرتے رہے ہیں۔ بعض موضوعات ایسے ہیں جن پر احتشام حسین اور اختر اورینوی دونوں نے خامہ فرسائی کی ہے اور دونوں میں جو مماثلت کا پہلو ہے وہ صرف یہ ہے کہ حقیقت پسندی اور ادب کے رشتے میں دونوں کا نقطہ نظر یکساں ہے اس فرق کے ساتھ کہ اختر اورینوی جمالیات کی باتیں کچھ زیادہ ہی تواتر کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے مضمون ''جمالیات'' کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتی ہوں یعنی اختر اورینوی نے ایک تفصیلی مضمون جمالیات پر بھی لکھا ہے جو ان کے مضامین کے مجموعے ''مطالعہ ومباحثہ'' میں شامل ہے۔ اس مضمون میں جن جہتوں کی طرف انہوں نے اشارے کئے ہیں وہ ہیں جبلت غذا، جبلت جنس، جبلت اقتدار اور جبلت جمال۔ غذا یا جبلت معاش کے اردگرد ہی ترقی پسندی گھومتی ہے۔ جبلت جنس اور جبلت اقتدار کو ترقی پسند ادباء وشعرا جبلت غذا کے پس منظر میں ہی دیکھنے کے عادی ہیں۔ لیکن جبلت جمال کا کوئی تصور ان کے یہاں نہیں ملتا ہے۔ احتشام حسین معاشی جبلت کے سب سے بڑے پیروکار ہیں اور مارکسی نقاد کے نقطہ نظر سے انہوں نے مارکسی معاشی پہلو کے پس منظر میں ادبی نگارشات کو دیکھنے کی سعی کی ہے۔ ظاہر ہے ان کے نقطہ نظر میں جبلت جمال کا کہیں گذر نہیں ہے۔ یہ وہ صورت ہے جو دونوں نقادوں کی راہیں الگ الگ کر دیتی ہے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:۔

> ''غرض جمالیات فن کے اقدار حسن، فنکار کے احساس حسن اور اس کی حسن کاری کا علم ہے۔ جمالیات اس انسانی جبلت کو جاننے کا علم بھی ہے جو فطری طور پر ہر انسان میں موجود ہے اور ابتدائے آفرینش سے

> موجود رہی ہے۔ فنون لطیفہ کی بنیادی قدر یہی جبلت جمال ہے جو خصوصیت بشریت ہے۔''(۱)

اس اقتباس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اختر اور ینوی فنون لطیفہ کی بنیادی قدر اور جبلت جمال کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں اور یہی وہ دیوار ہے جو احتشام حسین اور اختر اورینوی کے درمیان حائل ہے۔ اسے سمجھے بغیر دونوں کا مطالعہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

محمد حسن : احتشام حسین کے بعد ترقی پسند نظریات کی افہام و تفہیم میں سب سے زیادہ فعال رول ادا کرنے والوں میں محمد حسن کا نام سرفہرست ہے۔ محمد حسن ایک سائنٹفک مارکسی نقاد ہیں۔ زمانے کے طوفانی حوادث میں وہ ایک سچے مارکسی نقاد کی طرح اپنے نظریے پر اٹل رہے ہیں۔ اردو کی مارکسی تنقید کو ایک نئی جہت عطا کی ہے اور نقادوں کے لئے نئی راہیں بھی کھولی ہیں۔ مارکسی تنقید کے تعلق سے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:۔

> ''مارکسی تنقید دراصل فن اور زندگی کے باہمی رشتوں کی نگراں ہے وہ ایک طرف ادب اور زندگی کے ربط باہمی کو نظر میں رکھتی ہے، ادب زندگی پر اثر انداز ہونے کی کوشش میں زندگی سے اثر لیتا ہے، زندگی کو تبدیل کرنے کے عمل میں بہتر طور پر شریک ہونے کے لئے خود کو تبدیل کرتا ہے۔ دوسری طرف مارکسی تنقید ادب کے دائرے کے اندر رہ کر اسے ایک نئے تضاد سے آشنا کرتی ہے۔ تخلیقی شہ پارے اور اس کی تنقید یعنی اس کی اندرونی ترتیب، بیرونی رشتوں اور مجلسی عمل کے مطالعہ کے تضاد سے اور یہی وہ تضاد ہے جو ادب کو بہتر، تازہ تر اور شاداب تر

---

(۱) ''مطالعہ و محاسبہ''، اختر اورینوی، ص ۲۷

بنانے کا ذمہ دار ہے۔ اس لحاظ سے مارکسی تنقید پر ادبی منزل کے اندرونی تضاد کو نمایاں کر کے اور ہر اگلی تخلیق پر اثر انداز ہو کر اپنی تخلیقی آن بان کو قائم رکھتی ہے اور اس مقصد کو پورا کرتی ہے جو تنقید کا بنیادی مقصد ہے۔"(۱)

ڈاکٹر محمد حسن نے اردو تنقید کو ذاتی رائے زنی، تعصبات اور ترجیحات سے بلند کر کے ایک علمی اور فلسفیانہ سطح دینے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنی تنقیدات کے ذریعہ تنقید اور تخلیق کے رشتوں کو خیال انگیز اور دوررس بنانے کی سعی کی ہے۔ بقول کلیم الدین احمد:-

"انہوں نے (محمد حسن) اپنی الگ راہ نکالنے کی کوشش کی ہے، یا یوں کہئے کہ مارکسی تنقید اور جسے مارکسی نقاد ہئیتی تنقید کہتے ہیں وہ دونوں میں مفاہمت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

متذکرہ بالا تمام ناقدین کا موازنہ احتشام حسین سے کرنے پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سب کے یہاں احتشام حسین کے اثرات کسی نہ کسی طور پر موجود ہیں۔ اردو تنقید میں حالی کے بعد احتشام حسین ہی وہ سربرآوردہ نقاد ہیں جنہوں نے اپنے زمانے اور اپنے زمانے کے بعد آنے والے نقادوں کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے۔ عہد حاضر میں بھی ہندوپاک کے بیشتر ناقدین ان سے متاثر ہیں۔ موجودہ ناقدین میں سے بہت سے یا تو ان کے شاگرد رہ چکے ہیں یا پھر شاگردی کی حد تک ان سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے وسیع حلقہ اثر کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالمغنی رقمطراز ہیں:-

"واقعہ یہ ہے کہ مشاہیر ناقدین میں نئی نسل کے ساتھ سب سے قریبی اور براہ راست ربط احتشام حسین صاحب ہی کا تھا۔ وہ نئے اور ابھرتے

---

(۱) "ادبی تنقید"، ص ۵۶

ہوئے لکھنے والوں کی تحریروں کا برابر مطالعہ کرتے رہتے تھے اپنے
مضامین میں ان کا ذکر کرتے تھے اور ان سے ذاتی تعلقات بھی قائم
رکھتے تھے۔"(۱)

عبادت بریلوی، محمد حسن، شجاعت علی سندیلوی، شارب ردولوی، آغا سہیل، ابن فرید، خلیل الرحمن اعظمی وغیرہ کی تحریروں میں اگر احتشام حسین کے متعین کردہ اصول ونظریات کی بازگشت سنائی دیتی ہے تو اس میں اس لئے تعجب نہیں کہ یہ حضرات براہ راست احتشام حسین کے شاگردوں میں ہیں اور انہوں نے ان لوگوں کی ذہنی تربیت کی ہے۔ لیکن احتشام حسین سے متاثر ہونے والوں میں سردار جعفری، ممتاز حسین، خورشید الاسلام، قمر رئیس، سید محمد عقیل، شمیم حنفی، ظ انصاری وغیرہ بھی ہیں۔ نئی نسل کے ناقدین میں وزیر آغا، وحید اختر، شبیہ الحسن، شمس الرحمن فاروقی، محمود ہاشمی، وہاب اشرفی، مظہر امام، علیم اللہ حالی، عبدالمغنی وغیرہ کے یہاں بھی ان کے اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں اور اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ ان ناقدین نے بقدر ضرورت جائز طور پر ان سے استفادہ کیا ہے۔

احتشام حسین کی عظمت کا اندازہ ظ انصاری کے اس اقتباس سے بھی لگایا جاسکتا ہے:۔

"آپ کو کیا خبر احتشام صاحب ہندوستانی ادبیات کا مطالعہ کرنے
والے روسیوں کے دل میں آپ کا کتنا احترام ہے۔ درجنوں مضامین
آپ کے چراغ سے چراغ جلا کر لکھے گئے ہیں۔ آپ کا ایک ایک لفظ
پڑھا اور سمجھا گیا ہے۔"(۲)

***

---

(۱) "احتشام حسین اور نئی نسل"، مشمولہ: "آہنگ"، گیا، احتشام حسین نمبر

(۲) "احتشام حسین: ایک تاثر"، مطبوعہ "نیا دور"، احتشام حسین نمبر، ص ۳۷

محاکمہ اور نتائج

گذشتہ ابواب میں مختلف عنوانات کے تحت احتشام حسین کے تنقیدی کارناموں کی روشنی میں اردو تنقید کے ارتقا میں ان کی خدمات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب میں ان کی تنقیدی خدمات کا ایک مجموعی جائزہ اختصار کے ساتھ پیش کر رہی ہوں تاکہ بحیثیت ناقد احتشام حسین کی خدمات کا ایک نچوڑ آپ کے سامنے پیش ہو سکے۔ ممکن ہے اس عمل میں کہیں کہیں گذشتہ اوراق میں کہی گئی باتوں کا اعادہ ہو جائے۔

اردو تنقید سے متعلق کوئی بھی سنجیدہ کام احتشام حسین کے تنقیدی کارناموں کا جائزہ لئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا ہے۔ احتشام حسین ان معدودے چند ناقدوں میں ہیں جنھوں نے تمام تر تعصبات یعنی مجادلہ و مناظرہ، مدح سرائی و ہجو گوئی، تبلیغ و اشتہار بازی، وعظ و تلقین وغیرہ سے اوپر اٹھ کر پرورش لوح و قلم کی ہے۔ ان کی بلند آہنگ شخصیت مشرق و مغرب کی تہذیب و ثقافت کا حسین و متوازی امتزاج ہے۔ یہ ادبی روایات کے زبردست حامی و علمبردار ہیں۔ زبان و ادب کے خاموش خدمت گزاروں میں ہیں اور تصور تنقید کو وسعت و جامعیت کی انتہائی منزلوں تک لے جانے والوں میں ایک ہیں۔ حالی کے بعد احتشام حسین پہلے نقاد ہیں جنھوں نے ادب اور تنقید کے اصول و ضوابط پر کھل کر بحث کی ہے۔

احتشام حسین مارکسیت سے متاثر ہونے کے باوجود آنکھیں بند کر کے اسے قبول نہیں کرتے اس نظریے کو ادبی زاویۂ نگاہ سے جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی ناقد ادب کے محض ''غیر ادبی پہلوؤں'' ہی کو ادیب یا شاعر کا کمال فن سمجھتا ہے تو یہ ادب کے ساتھ صریحاً بے ادبی و بے انصافی ہے۔ اسے تنقید نہیں کہیں گے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے احتشام حسین کو عہد آفریں نقاد کہا ہے اور لکھا ہے کہ:۔

> ''پچھلے ۳۵-۴۰ سال سے اردو تنقید پر صرف ایک نقاد کی حکمرانی رہی ہے یعنی سید احتشام حسین کی۔ یہ حکمرانی جابرانہ اور آمرانہ نہیں تھی۔ ایسی شائستہ اور باوقار تھی کہ آج اس کا ذکر بھی شاید چونکا دینے کے لئے کافی ہوگا۔ یہ حکمرانی چیختی چنگھاڑتی انانیت کی حکمرانی نہ تھی جو زرق برق لباس میں جگمگاتی تخت و تاج سے مرصع ہو کر نظروں کو خیرہ کرتی بلکہ ایک ایسے ہمدرد اور دوست کی تھی جو دھیرے دھیرے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔'' (۱)

احتشام حسین نے جس زمانے میں تنقید کے میدان میں قدم رکھا وہ زمانہ لفظی موشگافیوں کا تھا۔ احتشام حسین نے پہلی بار تنقید کا رشتہ دانش عصر سے جوڑ دیا۔ انہوں نے تنقید کی بنیاد محض تاثیر یا صرف ونحو پر نہیں رکھی بلکہ اس کے جانچنے پرکھنے کے لئے بعض خارجی معیاروں اور معروضی اقدار پر زور دیا۔ اس طرح تنقید کو محض رائے زنی یا تقریظ و تاثیر کی سطح سے بلند کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ جملے بازی اور خواہ مخواہ کی لفظی صناعی سے گریز کر کے ایک خاموش، نرم اور مدھم استدلال سے اردو تنقید کو آشنا کیا اور یہی احتشام حسین کا اردو تنقید کو بہت بڑا تعاون ہے۔

احتشام حسین نے اردو تنقید کو نہ صرف ذہن دیا ہے، نہ صرف عصری وابستگی کی بصیرت

---

(۱) ماہنامہ ''شاہکار''، وارانسی، احتشام حسین نمبر، ص ۲۴۰

عطا کی ہے بلکہ نئے منہاجیات Methodology اور ایک نیا طریق کار بھی دیا ہے۔ ان منہاجیات یا طریقہ کار کے مطابق پہلے کسی فنکار کے عہد پر غور کرنا چاہئے، اس عہد کے اہم اقدار، عقائد، خیالات، نظریات کا جائزہ لینا چاہئے پھر فنکار کے طبقاتی رشتے، اس کی تعلیم و تربیت، ماحول، مشاغل اور دلچسپیوں کے ذریعہ اس کے مزاج اور فطرت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اس طریقہ کار کو خود احتشام حسین نے اپنے مضامین میں خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔

احتشام حسین نے اردو تنقید کو ایک معیار و مزاج بخشا ہے۔ ان کی تنقیدوں میں محض انشا پردازی نہیں ملے گی وہ بات کو سیدھے سادے انداز میں کہنے کے قائل ہیں۔ ان کے انداز بیان میں قطعیت کے عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ اس قطعیت میں نہ ادعائیت ہے اور نہ غیر ضروری میکانکی انداز۔ وہ ادبی تنقید کو محض اظہار ذات کا وسیلہ نہیں مانتے بلکہ سنجیدہ علمی مشغلہ سمجھتے تھے اور وہ اس سنجیدہ علمی مشغلے کی تمام پیچیدگیوں، تہہ داریوں، ذمہ داریوں اور کنہیات سے آگاہ بھی تھے، اس لئے ان کی تنقید میں فن کے بنیادی مسائل جھلکتے نظر آتے ہیں۔ احتشام حسین مصنف کی ذات کے مختلف مظاہر اور میلانات کے تقابلی مطالعے اور ان میں ہم آہنگی کی تلاش سے اس کی اصل شخصیت تک پہنچتے تھے اور ان متضاد عناصر اور میلانات میں ایک ایسا حیرت انگیز تطابق پیدا کر دیتے تھے جو قاری کو ادیب کے بارے میں ایک نئی بصیرت تک لے جاتا تھا۔ اس لحاظ سے احتشام صاحب نے اردو تنقید کو نئی جہت اور بلندیوں سے آشنا کیا۔

احتشام حسین نے تنقید کے مسائل و مباحث پر زور دیا ہے۔ وہ ادب کیا رہا ہے سے زیادہ ادب کو کیا ہونا چاہئے پر زور دیتے ہیں اور اس عمل میں جب وہ کسی مسئلے پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کے شانہ بہ شانہ پیدا ہونے والے اعتراضات کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں اور ان کا تجزیہ بھی کرتے چلتے ہیں اس تجزیے کے دوران ان کا انداز استدلالی اور تفہیمی ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کی باتیں بھی اسی دلچسپی اور غور کے ساتھ سنتے ہیں جس دلچسپی اور انہماک سے اپنی باتیں بیان

کرتے ہیں وہ کبھی آمرانہ اور تحکمانہ انداز میں دوٹوک فیصلہ نہیں سناتے ہیں بلکہ ان کا ہر فیصلہ مشروط ہوتا ہے۔

احتشام حسین کا قلم کبھی جمود یا تعطل کا شکار نہیں ہوا۔ ''تنقیدی جائزے'' سے لے کر ''تنقید اور عملی تنقید'' تک کا سفر انہوں نے تنقید کے نظریاتی اور اصولی مباحث کے ذریعہ طے کیا۔ اس مدت میں انہوں نے عملی تنقید کے نمونے پیش کئے لیکن اس دوران بھی ان کے یہاں نظریاتی مباحث کا رجحان غالب رہا۔ ''اردو ادب میں ترقی پسندی کی روایت''، ''ادب اور اخلاق''، ''قدیم ادب اور ترقی پسند نقاد''، ''مواد اور ہیئت''، ''ترقی پسندی کے مسائل''، ''افسانہ اور حقیقت'' وغیرہ ایسے مضامین ہیں جن پر اردو تنقید کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

''تنقید اور عملی تنقید'' کے بعد احتشام حسین کے پانچ اور تنقیدی مضامین کے مجموعے ''ذوق ادب اور شعور''، ''عکس اور آئینے''، ''افکار و مسائل''، ''اعتبار نظر'' اور جدید ادب: منظر و پس منظر'' شائع ہوئے ہیں۔

احتشام حسین کی تنقید نگاری کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی عملی یا نظری تنقیدوں میں ایک فلسفیانہ ماحول پیدا کرتے ہیں۔ انہوں نے مارکس کے مادی، جدلیاتی، اور سیاسی فلسفے کو بڑی ژرف نگاہی اور حسن بیانی کے ساتھ ادب کے قالب میں ڈھالا ہے۔ یہی فلسفہ جب دوسرے پیش کرتے ہیں تو ان کا ظرف چھلک جاتا ہے اور ان کی باتیں پروپیگنڈا معلوم ہونے لگتی ہیں۔ مگر احتشام حسین کے قلم سے مارکسی فلسفہ کی ادب میں ترجمانی فلسفیانہ بلندی اور حکیمانہ انداز بیان کی حامل ہے جس پر فن اور ادب کی نہایت گہری چھاپ ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ اردو ادب میں مارکسی نظریات کو دو چند خطرات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کچھ تو ایسے نادان دوستوں کے ہاتھوں صدمہ اٹھانا پڑا ہے جنہوں نے مارکسیت کو غلط سمجھ کر اس کے غیر اساسی پہلوؤں کو بنیادی اور اساسی قرار دے کر اپنی کم علمی اور نادان دوستی کا ثبوت دیا ہے اور کچھ ایسے دانا دشمن ہیں جنہوں نے منصوبہ بند طریقہ سے اشتراکیت کو اپنی علمی بے

بضاعتی کی وجہ سے غلط رنگ میں پیش کیا۔ نتیجے کے طور پر ایک خاص عہد میں کچھ ادیبوں اور شاعروں کی فعال جماعت کے باوجود عام طور پر شعر وادب میں اشتراکیت کو سخت آتش گیر نظریہ سمجھا جاتا رہا۔ ایسے دھند اور گمرہی کے ماحول میں اگر احتشام حسین نہ ہوتے یعنی ان کے تنقیدی کارنامے نہ ہوتے تو صحیح ترقی پسندی اور سچی مارکسیت اب تک ہماری سمجھ سے باہر رہتی۔ احتشام حسین اشتراکی ضرور تھے مگر انہوں نے اشتراکیت کو نہ تو وقتی فیشن کے جذبہ کے تحت اپنایا اور نہ اسے کبھی سیاسی اغراض کے لئے استعمال کیا۔ انہیں اس نظریہ حیات پر مکمل اعتماد تھا۔ انہوں نے اسے ایک مہذب فلسفہ حیات اور نظریہ معاشرت کے طور پر اپنایا۔ وہ صرف ادبی تنقید کے لئے ہی نہیں تنقید حیات کے لئے بھی اشتراکیت کو بہترین میزان سمجھتے ہیں۔ دراصل وہ ادب اور زندگی کو الگ الگ کانوں میں بانٹنے کے قائل ہی نہیں ہیں۔ وہ ایک سچے اشتراکی کی طرح ادب کو زندگی کے مثبت سفر کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ زندگی کے کارزار میں وہ شعر وادب کو ایک اسلحہ بھی قرار دیتے ہیں۔ ادب کی بے معنویت ان کی نگاہ میں اس طرح مہمل، گمراہ کن اور نقصان رساں ہے جس طرح زندگی کی بے معنویت ہوسکتی ہے۔ ان کا اس بات پر یقین کامل ہے کہ انسانی معاشرے میں ہر عمل کو انسان کے لئے مفید ہونا چاہئے۔

احتشام حسین واضح الفاظ میں ادب کا خاص موضوع ومفہوم انسان اور اس کے مسائل و معاشرے کو قرار دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی اصولی اور اساسی بات ہے جس سے ان لوگوں کو بھی اختلاف نہیں ہوسکتا جو مارکسی نظریات کے مخالف ہیں۔

احتشام حسین کے یہاں ایک مبلغ یا واعظ کی طرح دوٹوک فیصلے نہیں ملتے ہیں۔ یہ اسلاف کے کارناموں کو یکسر فراموش کرنے کے بھی قائل نہیں ہیں اور نہ اپنے نظریات و خیالات زبردستی دوسروں پر لادنے کی کوشش کرتے ہیں۔ احتشام حسین سے متعلق اس مقالے میں احتشام حسین کی تنقید نگاری کی انہیں خصوصیات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

***

کتابیات

	کتاب	مصنف
۱.	ادب اور نظریہ	آل احمد سرور
۲.	ارسطو سے ایلیٹ تک	جمیل جالبی
۳.	زاویہ نگاہ	خلیل الرحمٰن اعظمی
۴.	نقد الادب	حامد اللہ افسر
۴.	تنقید کیا ہے	آل احمد سرور
۵.	اردو تنقید کا ارتقاء	عبادت بریلوی
۶.	اردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد
۷.	نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری
۸.	ادب اور سماج	احتشام حسین

۹. روح تنقید — محی الدین قادری زور

۱۰. تنقید و تجزیہ — ابو محمد سحر

۱۱. تنقیدی نظریات (حصہ دوم) — احتشام حسین

۱۲. جدید اردو تنقید: اصول و نظریات — شارب ردولوی

۱۳. اردو میں تنقید — ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

۱۴. تنقیدی نظریات — ڈاکٹر سید عبداللہ

۱۵. عکس اور آئینے — احتشام حسین

۱۶. جدید اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات — ڈاکٹر خورشید جہاں

۱۷. تنقیدی دبستان — ڈاکٹر سلیم اختر

۱۸. ریپبلک — افلاطون

۱۹. روایت اور بغاوت — احتشام حسین

۲۰. انسائیکلو پیڈیا یا امریکانہ

۲۱. انسائیکلو پیڈیا برٹنکا سکنڈ اڈیشن

اخبار و رسائل

''شب خون''	الہ آباد	ستمبر، اکتوبر	۱۹۷۳
''الفاظ''	علی گڑھ	مارچ تا جون	۱۹۸۰
''شب خون''	الہ آباد	شمارہ ۱۱۰	
''زبان و ادب''	پٹنہ	اپریل	۱۹۷۶

"آج کل" دہلی دسمبر ۱۹۶۴

"الفاظ" علی گڑھ اگست ۱۹۸۳

"علی گڑھ میگزین" (نظریاتی ادب نمبر) ۱۹۵۸

"الفاظ" علی گڑھ جولائی-اگست ۱۹۷۳

"الفاظ" علی گڑھ جنوری تا مارچ ۱۹۸۳

Literature and Art By K. Marx & Angles

"شاہکار (اردو ڈائجسٹ)" (احتشام حسین نمبر) نومبر-دسمبر ۱۹۷۳

"آہنگ" گیا احتشام حسین نمبر

***

یادداشت

...sham Hussain Ka Tanqueedi Shaoor

By : Dr. Shaista Anjum Noori

ڈاکٹر شائستہ انجم نوری ادبی طور پر بہ...
رہی ہیں۔ انہوں نے ادبی، سیاسی اور سماج...
کافی لکھے جو مختلف رسائل اور اخبار کی زینت...
فکشن اور تنقید پر بھی انہوں نے کافی کام کیا ہے۔ ادھر خود بھی ایک فکشن نگار کی حیثیت سے ان کی شناخت بنے لگی ہے۔ مختلف رسائل وجرائد میں ان کے تنقیدی مضامین قارئین کی توجہ مبذول کرانے میں کامیاب رہے ہیں، اور ان مضامین سے شائستہ انجم نوری کے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی ان کی تنقیدی روش بھی آشکار ہوتی ہے۔

شائستہ انجم نوری کی عصری معنویت اور اردو ادب سے ان کی وابستگی کا اعتراف اس لئے بھی کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے ادب کی مختلف جہتوں اور صنفوں سے اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں نے اپنی متعدد تحریروں میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ ایک اصیل قلم کار ادب کے مختلف پہلوؤں پر دسترس رکھتا ہے۔ شائستہ انجم نوری بیک وقت تحقیق، تنقید اور تخلیق سے اپنی گہری وابستگی کی بنیاد پر اپنی شخصیت میں وسعت پیدا کر رہی ہیں۔ اس لئے ان کی تحریروں میں دانش وآگہی کے نقوش ملتے ہیں۔ یک رخاپن قلمکار کی شخصیت کو محدود کر دیتا ہے۔ ادب کی مملکت پر حکمرانی کا حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب لکھنے والا وسیع ادبی جہتوں سے دلچسپی رکھتا ہو۔ شائستہ انجم نوری کے یہاں یہ Thoroughness انہیں بہت آگے لے جا سکتی ہے۔

پروفیسر احتشام حسین کی انتقادی بصیرت کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنی کتاب میں کئی ایسے نکتے پیش کئے ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر احتشام حسین کی ہمہ گیر شخصیت کی تفہیم ڈاکٹر شائستہ انجم نوری کے اس مقالے سے آسان ہو جاتی ہے۔

میں شائستہ کی اس کتاب کا استقبال کرتا ہوں۔

پروفیسر علیم اللہ حالی

Eram Publishing House
Dariyapur, Patna - 800 004